علّم الانسان ما لم یعلم

العلماء ورثة الانبياء

چو شمع از پئے علم باید گداخت
کہ بے علم نتواں خدا را شناخت

گیا دورِ حکومت کا بس اب حکمت کی ہے باری — جہاں میں جا بجا سو علم و عمل کی ہے عملداری
جنھیں دنیا میں رہنا ہی رہے معلوم ہو اُن کو — کہ ہیں اب جہل و نادانی کے معنی ذلت و خواری

# تاریخ التعلیم

نوشتہ


جناب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب ایم اے، ڈی ایس سی، پی ایچ ڈی، سی آئی ای
پروفیسر مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڈھ حال ممبر کلکتہ یونیورسٹی کمیشن


## حصۂ اوّل

جس میں فن تعلیم و تدریس کی گزشتہ تاریخ علمی و عملی حیثیتوں سے بیان کی گئی ہے


قیمت عہ باہتمام محمد مقتدی خاں شروانی
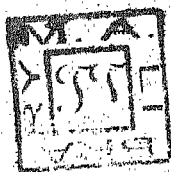
مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڈھ کالج میں طبع ہوکر

(سلطان جہاں منزل صدر دفتر کانفرنس علی گڈھ سے شائع ہوا)

۱۳۳۷ھ
۱۹۱۸ء

M.A.LIBRARY, A.M.U.
U35457

۳۵۴۵۷
CHECKED

# فن تعلیم و تدریس کی گزشتہ تاریخ

## تمہید

مسئلہ تعلیم کی تاریخ ایک لحاظ سے فلسفۂ تاریخ کا درجہ رکھتی ہے۔ نوع انسان نے جو ترقی ہر ملک ہر زمانہ و ہر قرن میں ذہنی اور اخلاقی حیثیتوں سے کی ہو اس کے تمام حالات و کیفیات اور اس کے متعلق تمام معلومات پر مسئلہ تعلیم کی تاریخ مشتمل ہے۔ اس اعتبار سے تو یہ مبحث اس قدر وسیع ہو کہ یہ مختصر اوراق اس کے بیان کرنے کے لئے ہرگز کافی نہیں ہو سکتے۔ حتیٰ کہ اس مسئلہ کی ایک محدود شاخ یعنی تاریخ تدریس ہی کو پورے طور سے بیان کرنا اس کی وسعت سے بالاتر ہے۔ تاریخ تدریس کے مورخ کا صرف یہی فرض نہیں ہو کہ وہ اُن تمام اصول و مسائل کو بیان کرے جو ماہرین فن نے وقتاً فوقتاً دنیا کے سامنے پیش کئے ہیں بلکہ اس پر یہ بھی لازم ہے کہ فن تدریس کے باب میں جو کچھ عملاً کیا جا چکا ہو اس کو بالتفصیل بیان کرے اور جو تعلیمی انسٹیٹیوشنز اور درسگاہیں مختلف زمانوں میں قایم کی گئیں ان کا خاص طور سے مطالعہ کرکے اظہار رائے کرے۔ میں اس وقت صرف تاریخ تدریس کے چند ضروری مسائل پر اظہار خیال کروں گا۔ یہ مسائل بھی بطور خود مسئلہ تعلیم کا ایک ضمنی جزو ہیں۔ ان مسائل کا بیان حسب ذیل چار حصّوں میں کیا جائے گا:۔

حصّہ اول میں مسئلہ تعلیم کی تاریخ علمی و عملی حیثیتوں سے بیان کی جائے گی۔ میری رائے میں اس کا جاننا زمانہ حال کے تعلیمی اصول کے متعلق صحیح رائے قایم کرنے کے لئے ضروری ہو۔

حصّہ دوم میں اُن طریقوں کا بیان ہوگا جو فی زماننا ترقی یافتہ ممالک میں مروّج ہیں مثلاً

انگلستان، فرانس، جرمنی، سوئٹزرلینڈ، مصر، امریکہ وجاپان وغیرہ ہیں۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اس سے ہم کو یہ رائے قایم کرنے میں مدد ملے گی کہ ہندوستان میں جو طریقہ تعلیم وتدریس اس وقت رائج ہے وہ کہاں تک صحت پر مبنی ہے اور اگر نہیں ہے تو کون طریقہ اختیار کرنا مناسب ہے۔

حصہ سوم میں بچوں کی خانگی اور مکتبی تعلیم پر بحث ہوگی اور ان ہر دو طریقہائے تعلیم کی خوبیوں اور برائیوں کو ظاہر کیا جائے گا۔ اس حصہ میں بحث کرتے وقت پیدایش سے لے کر سن رشد تک بچے کی حالت مدنظر رہے گی۔

حصہ چہارم میں اُن طریقہائے تعلیم کا بیان ہوگا جو اس وقت ہندوستان میں عام طور سے مروج ہیں یا جن کا رواج دینا مناسب ہے۔

اس مضمون میں میں نے صرف اوّل حصہ پر بحث کی ہے باقی تینوں حصوں پر میں کسی دوسرے وقت اپنے خیالات پیش کروں گا۔

اصلی موضوع کے متعلق اظہار خیال کرنے سے قبل میں عرض کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مسئلہ تعلیم نہایت وسیع مضمون ہے لیکن باوجود اس کی وسعت کے شاید ہی کوئی متنفس ممالک متحدہ میں ایسا ہوگا جو اس اہم مسئلہ کے ایک نہ ایک پہلو سے ذاتی دلچسپی نہ رکھتا ہو۔ اگرچہ یہ بالکل بدیہی امر ہے کہ مختلف مضامین درسیہ کی درس تدریس کے طریقوں سے صرف ان ہی لوگوں کو دلچسپی ہوسکتی ہے جو تعلیم وتعلم کو بطور پیشہ کے اختیار کرتے ہیں لیکن اس مسئلہ کے بہت سے پہلو ایسے بھی ہیں جن سے کوئی باشندۂ ملک اپنی ذات کو علیحدہ نہیں رکھ سکتا اور یہی وہ امور ہیں جن کے متعلق میں اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں۔ مثلاً بچوں کی تربیت، تعلیم کی غرض وغایت یا اس ملک اور ممالک غیر کی درسگاہوں کا طریقہ تعلیم وتدریس اور اسی مقصد سے میں نے اس مضمون کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

ہندوستان میں عام طور پر تعلیم کا مفہوم صحیح طور سے نہیں سمجھا جاتا اور اس بارے میں غلط رائے قایم ہوگئی ہے۔ مسلمانوں نے تو ایک عرصہ تک اور میں یہ عرض کروں گا کہ شاید

کچھ حد تک اب بھی موجودہ انگریزی تعلیم کو علم کی غرض سے حاصل نہیں کیا۔ نواب محسن الملک مرحوم نے اپنے ایک لکچر میں ایک موقع پر قدیم زمانہ کی ایک جید عالم کی گفتگو کا ذکر کیا تھا جن کو دوران گفتگو میں نواب صاحب مرحوم سے یہ معلوم ہو کر نہایت تعجب ہوا تھا کہ اقلیدس علم ہیئت اور ارسطو کا فلسفہ بھی انگریزی زبان میں پڑھایا جاتا ہے۔ حقیقتاً اب تک انگریزی تعلیم صرف کسب معاش کا وسیلہ سمجھا گیا۔ اور سمجھا جاتا ہے دوسری طرف حکومت نے ملازمت کے لئے یونیورسٹیوں کے خاص خاص امتحانات پاس کرنے کی لازمی شرط قرار دی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں گورنمنٹ کے نزدیک سررشتۂ تعلیم کے نزدیک، منیجران اسکول کے نزدیک حتیٰ کہ پبلک کے نزدیک انگریزی تعلیم کا مطمح نظر (آئیڈیل) یہ قرار پایا کہ یونیورسٹی کے امتحانات پاس کر لئے جائیں اور اسی معیار سے اور صرف اسی معیار سے ہر ایک پروفیسر کی لیاقت اور ہر ایک تعلیم گاہ کی کامیابی کی آزمایش کی جائے۔ یہ ظاہر ہے کہ جب تعلیم کی غرض و غایت ہی صرف امتحان پاس کر لینا ہو تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ ان درسگاہوں سے محقق و مجدد لوگ اور ہر شعبہ زندگی کے لئے کاملین فن پیدا ہو سکیں۔

ہندوستان میں اگر اصلی تعلیم پھیلانا مقصود ہے تو تعلیم کے مطمح نظر کو بالکل تبدیل کرنا پڑیگا اور اس کی علت غائی صرف امتحانات پاس کر لینا نہ سمجھی جائے گی بلکہ تعلیم کی غرض و غایت وہ شے ہوگی جس کی تشریح کومی نیس[1]، لاک[2]، روسو[3]، پستالوزی[4] نے کی ہے اور جس کی تفصیل آئندہ صفحات پر درج ہے۔ اس اعتبار سے ایک امی شخص بھی اکبر اعظم و سلطان علاء الدین خلجی کی طرح تعلیم یافتہ کہلایا جا سکتا ہے اور ایم اے اور ایل۔ ایل ڈی کے ڈگری یافتہ غیر تعلیم یافتہ ہو سکتے ہیں۔ تعلیم اور شے ہے اور نوشت و خواند میں قابلیت پیدا کر لینا اور چیز ہے۔ نوشت و خواند تعلیم کا ادنیٰ جزو ہے جس کی وضاحت لاک نے تفصیل کے ساتھ کی ہے۔

ہر شخص اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ ہندوستان کی جدید تعلیم اپنے منصوبوں میں کامیاب نہیں

---

[1] Comenius [2] Lock [3] Rousseau [4] Pestalozzi

ہوئی۔ اس ناکامی کے لوگوں نے اپنی اپنی رائے اور خیال کے مطابق مختلف وجوہ اور مختلف اسباب بیان کئے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ ہماری تعلیم غیر زبان میں ہونے کی وجہ سے نامکمل رہجاتی ہے۔ بعض لوگ اس نقص کو اُستادوں کی ناقابلیت اور والدین کی عدم توجہی پر محمول کرتے ہیں لیکن میری ناچیز رائے میں اس نقص کا سب سے بڑھکر سبب یہ ہے کہ ہم نے تعلیم کے مفہوم کو پورے طور سے نہیں سمجھا اور جب کبھی اور جہاں کہیں بھی تعلیمی درسگاہیں قایم کیں وہ تعلیم کے صحیح مفہوم سے الّا ماشاء اللہ ہٹی ہوئی تھیں۔ عام تعلیم کے لئے کسی خاص علم کا سیکھنا یا کسی خاص زبان کے ذریعہ سے سیکھنا ضروری نہیں۔ السنہ اور علوم کا انتخاب کرنا باشندگان ملک کے حالات اور ضروریات پر منحصر ہے۔ ایک ملک میں ایک زبان زیادہ مفید اور ضروری ہے، دوسرے ملک میں دوسری، مگر تعلیمی اصول ان سب قیود سے مبرّا اور تمام ملک اور تمام اقوام کے لئے یکساں ہیں۔

خاکسار

ضیاء الدین احمد

# باب اوّل

علم فلسفہ کی تاریخ قلمبند کرتے ہوئے ایک مصنف نے تمام زور قلم صرف اس تحقیق پر صرف کیا ہے کہ آیا حضرت آدم علیہ السّلام بھی فیلسوف تھے؟ اسی طرح علم التعلیم کے بعض مؤرخ اپنی خداداد قابلیتیں اور ذکاوت وفراست اس بات پر صرف کرتے اور اس میں باریک نکات نکالتے ہیں کہ ازمنہ سابقہ میں وحشیوں کی تعلیم کیونکر ہوتی تھی اور حضرت آدم علیہ السلام کے بعد جب پہلا انسانی خاندان بنا ہوگا تو اس میں تعلیم کی کیا کیفیت ہوگی لیکن میرا منشاء فن تعلیم کی تاریخ بیان کرتے سے ہرگز یہ نہیں کہ اس قدر قدیم زمانہ کے حالات کی طرف ناظرین کی توجہ منعطف کراؤں بلکہ برخلاف اس کے ان اوراق میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ اُن اقوام سے متعلق ہے جن کے تعلیمی اصول اور مسئلہ تعلیم کی بابت جن کے کارناموں نے باشندگان ہند کی تعلیم پر بالعموم اور مسلمانان ہند کے تعلیمی اصول پر بالخصوص خاص اثر ڈالا ہے۔

**قدیم ہندوستان کے باشندوں میں تعلیم کا طریقہ**

زمانہ قدیم میں تعلیمی اصول کی بنیاد ملک چین میں روایات قدیمہ پر اور ہندوستان میں ذات پات کے لحاظ سے قائم ہوئی۔ ہندوستان کے باشندے چار ذاتوں یا فرقوں میں منقسم تھے اور جو شخص جس ذات یا فرقہ میں پیدا ہوتا اس پر اسی ذات یا فرقہ کے مراسم و رواجات کا سیکھنا اور ان پر عمل کرنا فرض تھا اور ان ہی مراسم و رواجات کا سیکھنا بچّہ کی تعلیم کا اہم جزو خیال کیا جاتا تھا۔ البتہ شودر لوگوں (یعنی طبقہ ادنیٰ کے لوگوں) اور عورتوں کو ہر قسم کی تعلیم حاصل کرنے کی ممانعت تھی۔ تعلیم حاصل کرنا صرف بقیہ تین اعلیٰ طبقوں کے مردوں کا حصّہ تھا یعنی برہمن چھتری اور ویش ذات کے مردوں کا۔

**پاٹ شالے**

چھہ یا سات سال کی عمر ہو جانے پر بچّے کو مدرسہ میں داخل کر دیا جاتا تھا۔ ان مدرسوں یا پاٹ شالوں میں بالعموم کوئی برہمن مہاراج درس دیتے تھے۔ اُستاد یا گروجی کی

نہایت درجہ تعظیم و تکریم ہوتی تھی اور شاگرد (یا چیلا) اپنے والدین سے زیادہ اپنے گرو کی تعظیم و تکریم کرنا اپنا مقدس فرض سمجھتا تھا۔ پڑھائی بالعموم میدان میں کسی سایہ دار درخت کے نیچے ہوتی تھی نا موافق اور خراب موسم میں البتہ کسی چھپر کے نیچے یا جھونپڑے میں درس و تدریس کا شغل جاری رہتا تھا۔ پوجا پاٹ (مذہبی مراسم) اور اخلاقی تعلیم کے علاوہ لکھنا پڑھنا اور حساب بھی سکھلایا جاتا تھا۔ املا کی مشق ابتداءً تختیوں پر پنڈول سے کرتے تھے۔ گرو جی کے علاوہ چھوٹے بچوں کو بڑے لڑکے بھی سبق پڑھاتے اور سب طالب علم باہم آواز ملا کر چلا چلا کر پڑھتے تھے۔ آداب اور ضابطہ میں زیادہ سختی نہیں برتی جاتی تھی۔ اگر فہمایش اور نصیحت سے کام نہ چلتا تو اس حالت میں جسمانی سزا دی جاتی تھی جسمانی سزا یا تو تھپی مار کر یا ایسے طریقوں سے دی جاتی تھی جو ہندوستان کی خاص خصوصیت ہیں مثلاً مرغا بنانا یا سر پر پانی کا تریڑا دینا۔

اعلیٰ تعلیم کے نصاب کی مدت بارہ سال تھی اور یہ برہمن لوگوں کے لئے مخصوص تھی۔ اس میں صرف و نحو، ریاضی، معانی و بیان، فلسفہ، علم ہیئت، علم طب اور قانون کی تعلیم ہوتی تھی لیکن جسمانی تربیت کا کوئی خاص انتظام نہ تھا کیونکہ یہ لوگ قدرتاً جسمانی تربیت سے متنفر تھے۔ ان کے نزدیک اچھی اور خوش گزران زندگی کھانے پینے اور آرام کرنے پر محدود تھی اور انتہائی خوشی صرف نروان تھی۔ قدیم ہندوستان کے باشندے فطرتاً تخیلات کے بندے تھے اور ان کے مذہب کی تعلیم اس فطری رجحان کی موید تھی۔ ان کے نزدیک سچی خوشی اسی پر مبنی تھی کہ نفس امارہ کو تابع کرے اور دنیائے دنی کے خیالات کو ترک کرے۔ ان کے نزدیک یہی صحیح تعلیم کا آئیڈیل تھا۔

## بنی اسرائیل

(Israelites or Hebrews)

بنی اسرائیل کا عہد تقریباً چار ہزار برس تک رہا اور اس مدت مدید میں اس قوم کو کبھی تو فراغت

اور مرفہ الحالی سے بہرہ اندوز ہوتے اور کبھی فلاکت و بدبختی کی سختیاں برداشت کرنے کے گوناگوں مواقع پیش آئے۔ جب مصیبت کے دن آئے اور ایک بالشت زمین بھی اُن کے قبضہ میں نہ رہی تو خانہ بدوشی کی حالت میں یہ لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک میں منتقل ہوتے رہے لیکن اپنی قومی خصوصیات اور رسم و رواج کے نہایت سختی کے ساتھ پابند رہے۔ یہی وہ قوم ہے جس میں تمام ادیان صادقہ کی بنیاد پڑی اور اخلاق فاضلہ کا ایک ایسا نظام اس قوم کی بدولت دنیا کو ملا جو عیوب و نقائص سے مبرّا و منزّہ ہے۔

**یہودیوں میں تعلیم کا مقصد**

یہودیوں میں تعلیم کا مقصد و منشا یہ تھا کہ خدائے حی و قیوم کے فرمانبردار اور مطیع و منقاد بندے پیدا کئے جاویں۔ یہ لوگ اپنے دروازوں اور پھاٹکوں پر کلام الٰہی کو منقوش کرتے تھے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نوشت و خواند کا طریقہ قدیم زمانہ کے یہودیوں میں عام طور سے رائج تھا لیکن مردوں ہی تک محدود تھا۔ لڑکیوں کو سینا پرونا چرخہ کاتنا اور کھانے پکانے اور خانہ داری کی تعلیم دی جاتی تھی اور یہی وہ تعلیم ہے جو ہم اس زمانہ میں بھی "ڈومیسٹک اکانومی" Domestic Economy (امور خانہ داری) کے تحت میں اپنی لڑکیوں کو دیتے ہیں۔ یہودیوں میں موسیقی کا بھی رواج تھا۔

**طریقہ تعلیم**

قدمائے یہود میں تعلیم زیادہ تر خانگی طور سے دی جاتی تھی لیکن پہلی صدی عیسوی میں مدارس قایم ہوئے۔ ۶۴ء میں بطریق اوّل جوشوا ابن غمالہ نے ہر قصبہ کے باشندوں کو مدرسہ کی مالی مدد کرنے پر بذریعہ احکام مجبور کیا اور درصورت خلاف ورزی اُن کو برادری سے خارج کیا جاتا تھا۔ اگر بچوں کی تعداد ۲۵ سے متجاوز نہ ہوتی تو مدرسہ کے لئے ایک ہی اُستاد ہوتا تھا اور ۲۵ سے زیادہ بچوں کے لئے قصبہ کے باشندوں کو ایک مددگار معلم مقرر کرنا پڑتا تھا اور ۴۰ سے زیادہ تعداد کے لئے دو اُستاد مقرر ہوتے تھے۔

صوبجات ممالک متحدہ میں جو اصحاب مکاتب کے قیام اور اُن کی تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہیں اُن کے لئے یہودیوں کے ابتدائی تعلیم کے مفصّل قواعد و احکام کا مطالعہ کارآمد ہوگا۔

**اُستاد کا درجہ**

مثل دیگر اقوام قدیمہ کے بنی اسرائیل میں اُستاد کا بہت بڑا درجہ تھا ان کی نہایت توقیر و تعظیم ہوتی تھی اور اُن کو صحیح معنوں میں سرپرست ملک خیال کیا جاتا تھا توریت میں مذکور ہے کہ "اگر تمھارے اُستاد اور تمھارے باپ کو تمھاری مدد کی ضرورت ہو تو باپ سے قبل اُستاد کی اعانت کرو کیونکہ باپ تو تمھاری دنیاوی زندگی کا باعث ہے اور اُستاد نے تم کو آخرت کی زندگی بہم پہنچائی"

**بنی اسرائیل میں تعلیم دینے کا طریقہ**

چھ سال کی عمر میں بچّہ مدرسہ میں داخل ہوتا تھا اور سب سے پہلے توریت پڑھائی جاتی تھی۔ معلّم کی خاص کوشش یہ ہوتی تھی کہ تلفظ صحیح ہو مطلب سمجھانے کے لئے اُستاد بار بار مطالب بیان کرتا تھا اور اگر ضرورت ہوتی تو اپنے بیان کو چار سو مرتبہ تک دُہرانے میں اس کو تامل نہ ہوتا تھا۔

مدارس میں نوشت و خواند، قدرے طبعیات اور زیادہ تر اقلیدس و علم ہیئت پڑھایا جاتا تھا اور پڑھاتے وقت اخلاقی امور کی بھی تلقین ہوتی رہتی تھی۔

اگر ہم اس طریقہ تدریس کا جو سنہ عیسوی کے اوائل میں یہودیوں میں مروّج تھا اپنے یہاں کے پرانی طرز کے مکتب کی تعلیم سے مقابلہ کریں تو یہی نتیجہ اخذ کریں گے کہ ہمارے پرانی طرز کے مکتب اب تک یہودیوں کے مدارس کے دقیانوسی نمونہ پر قائم کئے گئے ہیں اور باوجودیکہ زمانہ حال کے ماہرین فن تعلیم اور مصنفین نے نہایت صاف اور مدلّل طریقہ سے اس طریقہ تعلیم کے نقائص کا اظہار کر دیا ہے مگر ان مکتبوں میں قدیم زمانہ کے متروک طریقوں کو اب تک برقرار رکھا گیا ہے۔ تعلیم و تدریس کا فن ممالک متمدنہ اور ترقی یافتہ اقوام میں ایک خاص سائنس ہو گیا ہے اور نہایت کامیاب اُصولوں کے ماتحت نئی نسلوں کے قوائے ذہنی و دماغی و جسمانی کی تربیت کی غرض سے نہایت وسیع پیمانہ پر انتظامات جاری ہیں لیکن اس ملک اور بالخصوص ہماری قوم میں ہی دقیانوسی و از کار رفتہ طریقوں کی پابندی پر اصرار ہے

## اہل یونان

تمام یونانی ریاستوں یا بالفاظ دیگر تمام یونانی شہروں میں سے صرف دو مشہور

شہر یعنی اسپارٹا Sparta اور ایتھنز Athens تاریخ تعلیم و تعلّم کے لحاظ سے قابل توجہ ہیں۔ ان میں سے ہر شہر نے مختلف پہلوؤں پر اپنے تعلیمی مطمح نظر کے اعتبار سے ترقی کی تھی۔

**اسپارٹا** اس شہر میں یونانیوں کی ڈورین Dorain نامی ایک مضبوط اور بہادر قوم کے لوگ آباد تھے اور لائی کرگس Lycurgus نے جو نظام تمدن (قانون حکومت) قایم کیا تھا اس کی وجہ سے اس قوم کی فطری خصوصیات برقرار رہیں۔ اس مشہور مقنن کا خاص کارنامہ وہ حکم ہے جس کی بدولت بقول پلوٹارک Plutarch کے اس نے عیش و عشرت غرور و تکبر اور دولت سمیٹنے کی خواہش کو نیست و نابود کر دیا۔

اہل اسپارٹا کی تعلیم زیادہ تر جسمانی تربیت مبنی تھی۔ بچوں کو سلطنت کی ملکیت سمجھا جاتا تھا۔ ۷ سال کی عمر تک بچے اپنے قدرتی سرپرستوں کی حفاظت اور نگرانی میں رہتے اور اس کے بعد پبلک تعلیم گاہوں میں بھیجدیئے جاتے تھے جہاں اُن کو ایک درشت ضابطہ کا پابند ہو کر رہنا پڑتا تھا۔ ۱۲ سال کی عمر ہو جانے پر اُن کو کسی قسم کے قمیص و بنیان پہننے کی اجازت نہ دی جاتی تھی۔ صرف ایک کوٹ ملتا تھا جو سال بھر پہننا پڑتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی ٹکریوں میں یہ بچے ایک ساتھ رہتے اور ایسے بستروں پر سوتے جن کو وہ بغیر چاقو کی مدد کے درختوں کی ٹہنیاں توڑ توڑکر خود اپنے ہاتھوں سے بناتے تھے۔ جسم کو مضبوط اور سخت بنانے کے خیال سے جمناسٹک کی ورزشوں کی مشق کرائی جاتی تھی۔ غرضکہ ان کی تعلیم تمامتر دار و مدار اس قسم کی زندگی بسر کرتا تھا جو آجکل فوجی رنگروٹوں کو کیمپ میں بسر کرنا پڑتی ہے۔

اخلاقی تعلیم میں بہت سے پہلو قابل تعریف تھے۔ اسپارٹا کے نوجوانوں کو اس کی تعلیم دی جاتی تھی کہ وہ اپنی خواہشات پر قادر رہیں اور اپنی تمام عادات میں میانہ روی اور اعتدال کو قایم کریں۔ سردی و گرمی اور بھوک پیاس اور تکان کا ان کو عادی بنایا جاتا تھا۔

**بزرگوں کا احترام** والدین کی اطاعت، بڑوں کا ادب، اور مسلمہ و مروجہ رواجوں کے

احترام کا مادہ اُن میں پیدا کیا جاتا تھا۔ بڑوں کا ادب و احترام اس درجہ تھا کہ یہ بات بطور ایک مثل مشہور تھی کہ اگر بوڑھا ہو کر رہے تو اسپارٹا میں رہے۔ بڑوں کو ادب کے ساتھ جھک کر سلام کیا جاتا اور اُن کے آنے پر سروقد کھڑے ہو کر تعظیم کی جاتی تھی۔ جب کبھی بڑے آتے تھے تو ہر شخص جگہ خالی کر دیتا اور نہایت عجز و انکسار کے ساتھ ان کی نصیحتوں اور ان کے مشوروں کو سنتا اور ان پر عمل کرتا تھا۔ یہ ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ایتھنز کے ایک تھیٹر میں ایک ضعیف آدمی کچھ دیر کر کے پہنچا اور وہاں اس کو جگہ نہ ملی۔ جبکہ وہ جگہ کے لیے متفکر کھڑا ہوا تھا تو ایتھنز کے چند نوجوانوں نے اس کو اپنی طرف بلایا جب بمشکل ان کے نزدیک پہنچا تو اُن نوجوانوں نے اس کو جگہ نہیں دی اور اُس کو کھڑا رکھ کر مضحکہ اُڑایا۔ یہ معمر شخص گھبرا کر اُن نوجوانوں کے پاس سے دوسری طرف چلا جہاں ایک بنچ پر اسپارٹا کے سفرا بیٹھے ہوئے تھے جو اس حالت کو دیکھ رہے تھے۔ جب وہ ان کے قریب پہنچا تو وہ تمام سفیر مل کر کھڑے ہو گئے اور ضعیف آدمی کو بڑے ادب اور توقیر کے ساتھ ہاتوں ہات لیا اور بٹھلایا۔ اس واقعہ کا بہت بڑا اثر باشندگان ایتھنز پر پڑا اور وہ اہلِ اسپارٹا کی اس خاص خوبی سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے نعرہ خوشی بلند کیا۔ اس پر ضعیف آدمی کھڑا ہوا اور اس نے کہا کہ "اہلِ ایتھنز تو صرف خوبیوں کو سمجھتے اور داد دیتے ہیں مگر اہلِ اسپارٹا ان خوبیوں پر عامل ہیں"۔

اہلِ اسپارٹا نے موسیقی کی تعلیم کو فراموش نہیں کیا تھا لیکن موسیقی کا ہمیشہ اخلاقی پہلو مدِ نظر ہوتا تھا اور عام طور سے ایسے محسنین قوم کی شان میں راگ الاپے جاتے تھے جنھوں نے اپنے ملک و قوم کے لئے اپنی جانیں قربان کیں تھیں۔

توانا اور مضبوط نسل کی افزایش کے خیال سے لڑکیوں کو بھی جمناسٹک کی ورزشوں کی مشق کرائی جاتی تھی۔

ایتھنز | سولن Solon نے جو منجملہ سات حکمائے یونان کے ایک مشہور حکیم اور ایتھنز

کے نظام کا بانی اور مقنن تھا جسمانی اور ذہنی تربیت کو مساوی درجہ پر رکھا ہے۔ سولن کا ایتھنز میں وہی رتبہ ہے جو لائی کرگس کا اسپارٹا میں تھا۔ اس کا قول ہے کہ بچوں کی تعلیم میں لکھنے پڑھنے اور تیراکی سیکھنے کو اور چیزوں پر فوقیت دینا چاہیئے۔ تعلیم کے متعلق یہ مطمح نظر ایتھنز والوں کے دلوں میں اتنا راسخ ہو گیا تھا کہ نہایت درجہ جہالت ظاہر کرنے کے لئے بطور مثل کے یہ فقرہ استعمال کیا جاتا تھا کہ "وہ نہ تو الف بے جانتا ہے اور نہ تیراکی"۔

ایتھنز کی جمہوریت میں صرف جسمانی تعلیم کے متعلق انتظام تھا۔ جمنازیم[1] Gymnasium کے ڈائرکٹر کا ہر سال مجلس عامہ انتخاب کیا کرتی تھی۔ موسیقی اور صرف و نحو کے مدارس قایم کرنا پرائیوٹ کوششوں پر منحصر تھا۔ سولن نے اپنے مجوزہ قانون حکومت میں صرف و نحو جمناسٹک اور موسیقی کی تعلیم شہر کے مرفہ الحال باشندوں کے لئے اور نوشت و خواند و تیراکی اور کسی پیشہ کی تعلیم غربا کے لئے قرار دی تھی۔

ایتھنز میں چھ یا سات سال کی عمر تک کے بچے دایہ کی نگرانی میں رہتے تھے اور سات سال کی عمر ہونے پر ان کو گرامر اسکول (مدارس زبان آموزی) اور جمنازیم میں داخل کر دیا جاتا تھا۔ معلم صرف و نحو اکثر اوقات کھلے میدانوں سڑکوں اور عام گذرگاہوں میں درس دیتے اور نوشت و خواند و مذہبی قصہ پڑھاتے تھے۔ ہومر Homer کی مشہور تصنیف لڑکوں کے درس میں داخل تھی۔ موسیقی کے مدارس میں اولاً گانے کی تعلیم ہوتی تھی اور اس کے بعد سارنگی اور ستار بجانا سکھایا جاتا تھا۔

## حکمائے سوفسطائیہ (Sophists)

گرامر اسکولوں کی بدولت اہل ایتھنز میں ہر قسم کے علوم سیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا اور ان کے سیاسی نظام کے لئے بحث و مباحثہ اور تقریروں میں خاص مہارت کی ضرورت تھی۔

---

[1] قدیم یونان میں ایک قسم کا مدرسہ۔

اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے معلمین کے ایک نئے گروہ کو عروج حاصل ہوا۔ یہ لوگ اپنے تئیں سوفسطائی (یعنی دانشمند) سے موسوم کرتے تھے۔ اور ہر چیز کے سکھانے کے دعویدار تھے۔ یہ لوگ نوجوانوں کو ایسا برق کر دیتے تھے کہ بحث و مباحثہ میں دلیل کے دونوں پہلوؤں کو کامیابی کے ساتھ نباہ سکیں معمہ اور چیستاں کے استعمال کرنے میں ان کو کمال حاصل تھا جو معمے منطق کی کتب درسیہ میں مندرج ہیں ان کے ایجاد کا سہرا زیادہ تر ان ہی حضرات کے سر ہے۔ جو معمے کہ عام طور سے استعمال ہوتے تھے ان میں سے بطور نمونہ کے ایک کو یہاں درج کرتے ہیں:۔

ایک شاگرد نے قانون کی تعلیم ایک اُستاد سے حاصل کی اور شرط یہ کی کہ جس وقت وہ پہلا مقدمہ جیتے گا پانچسو روپیہ اُستاد کو دے گا۔ قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد شاگرد نے وکالت شروع نہیں کی۔ اُستاد نے جب پانچسو روپیہ مانگے تو اُس نے پہلے مقدمہ کی جیت کی شرط کو یاد دلایا اور صاف ظاہر ہے کہ وکالت نہ کرنے کی حالت میں اُستاد کو روپیہ مانگنے کا کوئی حق نہ تھا۔ اس پر اُستاد نے جج کے سامنے دعویٰ دائر کر دیا چونکہ دونوں قانون دان تھے اس لئے بذات خود مقدمہ کی پیروی کرنے لگے۔ دوران مقدمہ میں اُستاد نے جج کو مخاطب کر کے کہا کہ مائی لارڈ! آپ کا فیصلہ کچھ ہی کیوں نہ ہو آپ مجھکو پانچسو روپیہ میرے شاگرد سے دلوا دیجے۔ اگر فیصلہ میرے موافق ہے تو میں آپ کے حکم سے پانچسو روپیہ کا مستحق ہوں اور اگر فیصلہ میرے شاگرد کے موافق ہے تو یہ پہلا موقعہ ہے کہ وہ جو مقدمہ جیت رہا ہے اور اس لئے ہمارے عہد کے اعتبار سے مجھکو پانچسو روپیہ ملنے چاہئیں۔ اس کے بعد شاگرد کھڑا ہوا اور کہا کہ مائی لارڈ! آپ کا فیصلہ کچھ ہی کیوں نہ ہو میرے اوپر روپیہ نہیں نکلتا اگر آپ کا فیصلہ میرے موافق ہے تو آپکے حکم کے اعتبار سے پانچسو روپیہ دینے سے میں بری ہو گیا اور اگر آپ کا فیصلہ میرے خلاف ہے تو چونکہ پہلا مقدمہ ہار رہا ہوں اس لئے میرے ذمہ روپیہ واجب الادا نہیں ہے۔ ان منطقی دلائل سے جج اس قدر پریشان ہوا کہ وہ ایک عرصہ

تک اس کا فیصلہ دینے سے قاصر رہا۔

سوفسطائی طریقہ تعلیم کا دارومدار صرف اسی بات پر تھا کہ سطحی معلومات حاصل ہو جائیں اور چند منتخب تقریروں کو حفظ کر لیا جائے اور دلائل کا مقابلہ لفاظی سے کرنے کی مہارت پیدا ہو جائے۔ اس تعلیم کی خصوصیت تدریس تھی اس کو تربیت سے کچھ واسطہ نہ تھا۔

سوفسطائیوں کے اثر کا یہ حال تھا کہ ایتھنز کے نوجوانوں نے حصول علم کے قدیم طریقہ کو جو گرامر اسکولوں اور جمنازیم کی تعلیم پر مشتمل تھا ترک کر دیا اور ان کو اس سے نفرت پیدا ہو گئی۔ سیاست کے میدان میں گوئے سبقت لے جانے اور امتیاز پیدا کرنے کے آرزومند ہو گئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ جب کوئی سوفسطائی صاحب گذرگاہ عام پر جلوہ افروز ہوتے تو ان کے گرد نوجوانوں کی بھیڑ لگ جاتی۔ ایتھنز کے نوجوانوں میں یہ خواہش عام طور سے پیدا ہو گئی تھی کہ سوفسطائیوں سے مستفیض ہوں اور ان کے طرز استدلال اور بحث و مباحثہ کے طریقوں کو اختیار کر لیں لیکن ان کے اثر کا نتیجہ بقول ارسطافنوس Aristophanes یہ مرتب ہوا کہ "ایتھنز کے نوجوان تنگ خیال اور زبان دراز ہو گئے"۔

حضرات سوفسطائیہ ہر بات میں دخل در معقولات کے مرتکب ہوتے تھے انھوں نے ایتھنز کی روایات اور تہذیب و تمدن کو درہم برہم کر دیا۔ نکتہ چینی کرنے میں ان حضرات نے انہدام و انتشار کے اصول پر عمل کیا اور جو پرانی چیز برباد کی اس کی جگہ کوئی نئی بات قایم نہیں کی ان کا کام صرف نفی تھا یعنی ہر چیز کی بیخکنی کریں مگر کسی قسم کی مثبت یا تعمیری کام کرنے سے یہ لوگ ہمیشہ قاصر رہے۔ غرضکہ ہر بات کی مخالفت کرنا ان کا خاصہ طبعی ہو گیا تھا مگر اپنی شخصیت کے بچاؤ میں وہ مل کر آپس میں ایک ہو جاتے تھے۔

حضرات سوفسطائیہ نے ایتھنز کے روایات مخصوصہ اور تہذیب و تمدن کے انہدام و بربادی کا جو رجحان پیدا کر دیا تھا اس کی روک تھام کے لیے سقراط Socrates و افلاطون Plato و ارسطو Aristotle جیسے عقلائے دہر پیدا ہوئے جنھوں نے نہ صرف سوفسطائیوں کے زہریلے

اثر کو نیست و نابود کیا بلکہ تعلیم کے صحیح اصول کی بنیاد قایم کی۔ اگر یونانی قوم میں سقراط پیدا نہوتا اور ہر موقعہ اور ہر محل پر حضرات سوفسطائیہ کی سطحی معلومات اور غیر منطقی دلائل کا مضحکہ اُڑا کر اُن کی قلعی نہ کھولتا تو ہر گز یونانیوں کو دنیا کے تہذیب و تمدن میں وہ درجہ اور رتبہ حاصل نہوتا جو انکو بتیسر ہوا۔ اسوقت اہل یونان سنجیدہ دلیلوں اور سنجیدہ باتوں کے سننے کے لئے گویا گونگے اور بہرے ہو گئے تھے اور یہ زہریلا اثر صرف اس طریقہ سے دور ہو سکا کہ سقراط نے نوجوانوں کو راہ راست پر لانے کے لئے وہی طریقے برتے اور وہی ذرائع اختیار کئے جن کے ذریعہ سے حضرات سوفسطائیہ نے ان کو گمراہ کیا تھا۔

**سقراط** سقراط کی پیدایش ۴۶۹ھ (قبل مسیح) میں واقع ہوئی اور ۳۹۹ھ (ق م) میں اس کے ہموطنوں نے اس الزام کی پاداش میں اس کو قتل کیا کہ ایتھنز کے نوجوانوں کے خیالات اپنی عجیب و غریب باتوں سے پراگندہ و خراب کرتا ہے۔

سقراط کو افلاطون و زنوفن Znophon دو شاگرد رشید ملے اور ان ہی دونوں نے اس کے طریقہ استدلال کو فروغ دیا۔ سقراط ایک طرف تو غلطیوں اور غلط خیالات کی بیخکنی کرتا ہے اور دوسری طرف وہ استفادۃً ایسے سوالات قایم کرتا ہے اور رفتہ رفتہ اپنے خاص طریقہ استدلال سے جس کو "سقراطی طریقہ استدلال" کہتے ہیں اپنے مخاطبین کو تناقض و تضاد کی بھول بھلیوں میں پھنسا دیتا ہے۔

سقراط کو علوم حقیقی کا موجد کہنا بالکل حق بجانب ہے کیونکہ اسی نے صحیح غور و فکر کی بنیاد ڈالی۔ اس نے اپنے مدمقابل حضرات سوفسطائیہ کی طرح مناظرہ کا طریقہ اختیار کیا۔ ان کی غلطیوں پر اُن کو قائل معقول کیا اُن کی جہالت اور نادانی کی خوب قلعی کھولی اور ہر موقعہ اور ہر محل پر جاہل و عالم ادنیٰ و اعلیٰ سے مناظرہ کرکے انھیں مجبور کیا کہ صحیح خیالات قایم کریں اور سطحی معلومات چھوڑیں۔ سوفسطائیوں کے غلط اصول اور ان کی سطحی معلومات کی قلعی کھولنے سے سقراط نے اہل ایتھنز میں یہ مادہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ اس کے شاگرد افلاطون کے قایم کردہ اصول کو

قبول کر سکیں۔ خود افلاطون کا قول ہے کہ "ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی خیال ہوتا ہے کہ ہم وہ جانتے ہیں جو حقیقت میں ہم نہیں جانتے۔ اپنی نادانی اور ذہنی پستی کا احساس ہی حقیقی علم کے حصول کے لئے بمنزلہ پہلے قدم کے ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ ترقی کے لئے اپنی پستی کا احساس نہایت ضروری ہے۔ سرسید علیہ الرحمۃ نے لارڈ ڈفرن کو جو ایڈریس دیا تھا اس میں مسلمانان ہند کی پستی اور تنزل کا تذکرہ کیا گیا تھا جس پر لارڈ موصوف نے کہا تھا کہ "اب مجھکو امید ہوتی ہے کہ مسلمان ترقی کریں گے کیونکہ وہ اب اپنی حالت کو محسوس کرنے لگے ہیں۔" جو اشخاص "مشرق" اور "مغرب کے سری ملاک" اور مسلمان کو "سارے جہان" اور ہفت اقلیم کا مالک قرار دے کر نفس کو ابھارتے اور مسلمانوں کی قوم میں "ہمچو من دیگرے نیست" کا خیال پیدا کرتے ہیں۔ گو اس میں شک نہیں کہ ایسے خیالی مضامین کو پڑھ کر ایک خاص مسرت ضرور حاصل ہوتی ہے مگر فی الحقیقت یہ خیالات ترقی کے لئے سدراہ ہیں اور جب تک کسی قوم سے تفاخر بیجا دور نہ ہو گا ترقی محال ہے۔

## افلاطون Plato

افلاطون ایتھنز کے مشہور مقنن سولن کی نسل سے تھا اور اس کی پیدائش ۴۲۷ء قبل مسیح کی ہے۔ اس کی مشہور و معروف تصنیف "ریپلک" Republic (جمہوریت) پر اگرچہ دنیا کے مختلف علمانے مختلف پہلوؤں سے تنقید کی ہے اور اس پر ہر طرح سے موافق اور مخالف خیالات کا اظہار کیا گیا ہے مگر یہ امر واقعی ہے کہ فن تعلیم کو خاص علمی بنیاد پر قایم کرنے اور اس کو ایک خاص فن قرار دینے میں یہی سب سے پہلی تصنیف ہے روسو Rousseau کا قول ہے کہ "اگر تعلیم عامہ کا مفہوم تم معلوم کرنا چاہتے ہو تو افلاطون کی کتاب ریپلک کا مطالعہ کرو۔"

افلاطون نے جس جمہوری سلطنت کا خاکہ اپنی کتاب میں کھینچا ہے وہ تقریباً ناقابل عمل ہے اور شیخ چلی کے منصوبہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ تعلیم کے بارہ میں اس کی رائے ہے کہ پیدائش

کے دن سے بچوں کو دایوں کے سپرد کرنا چاہیئے اور اس کی احتیاط رکھنی چاہیئے کہ کوئی ماں اپنے لخت جگر کو شناخت نہ کرنے پائے۔ اور جب بچّے چھ برس کے ہو جائیں تو اُن کو سرکاری مدارس میں داخل کر دیا جائے اور سلطنت کی طرف سے جو پیشہ اور جو کام جس لڑکے کے لئے معیّن ہو وہی کام او پیشہ اُس کو سکھایا جائے۔

افلاطون نے حضرات شعرا پر خاص عنایت کی ہے۔ اور اُن کے لئے اپنی خیالی سلطنت میں کوئی جگہ نہیں رکھی۔ وہ اُن کو شہر بدر کرکے اگرچہ سرحد پار پہنچا دینا چاہتا ہے، مگر اتنی اُن کے ساتھ رعایت ضرور کرتا ہے کہ وہ جس قدر تیل چاہیں اپنے سروں میں ڈال لیں اور جس قدر پھولوں کے ہار چاہیں پہن لیں۔ قصّہ نویسوں کو بھی یہی قدغن ہے کہ بیہودہ قصّے اور کہانی نہ لکھیں اور دایوں کو مشورہ دیا ہے کہ عمدہ قصّے بچوں کو سُنائیں۔

افلاطون نے اپنے فرضی شہر میں سکونت اختیار کرنے کا حق صرف توانا و تندرست اشخاص کو دیا ہے۔ اور کمزور مریض و ضعیف الجثہ لوگوں کے لئے اگرچہ اس نے صاف طور پر قتل عام کا فتویٰ تو نہیں دیا مگر تقریباً اس کے مرادف الفاظ میں وہ کہتا ہے کہ "اُن لوگوں کو اُن کی اپنی حالت پر چھوڑ کر علیحدہ ہو جاؤ" یعنی مرنے دو۔ کیونکہ اُس کی رائے میں سلطنت کے مفاد کا یہی اقتضا ہے کہ جو اشخاص فرایض ملکی ادا کرنے پر بوجہ خرابی صحت قابلیت نہیں رکھتے اُن کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

سلطنت کے کاروبار کے لئے سیاست دان مُدبّرین کا انتخاب افلاطون مثل دیگر مشرقی ممالک کے مقتدایان مذہب میں سے نہیں کرنا چاہتا بلکہ فلسفیوں کو اس خدمت پر مامور کرتا ہے اور اس کی رائے ہے کہ تا وقتیکہ فیلسوف حضرات بادشاہ یا حاکم نہ بنائے جائیں اور سیاسی اقتدار اور فلسفہ ایک ہی ذات میں مجتمع نہ ہو اُس وقت تک سلطنتوں کو اور نوع انسان کو عیوب و ذمایم سے نجات نہیں مل سکتی۔

**تعلیم اُناث** افلاطون ہی دنیا میں پہلا شخص ہے جس نے عورتوں کی تعلیم کی حمایت کی ہے

اور مردوں کی طرح عورتوں کے لئے تعلیم کا اہتمام کیا ہے اور اس خصوص میں نہ صرف اپنے ہمعصروں بلکہ اپنے مابعد زمانہ میں بھی وہ بمدارج اعلیٰ خیالات رکھتا تھا جس جوش اور مدلّل طریقہ کے ساتھ تعلیم نسواں کی حمایت افلاطون نے مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے شاید اب تک کسی نے نہیں کی وہ کہتا ہے "انتظام سلطنت میں نہ تو کسی عورت کا محض اس بنیاد پر کہ وہ عورت ہے کسی علم یا کاروبار سے محروم رکھنا جائز ہے اور نہ کسی مرد کا محض اس لئے کہ وہ مرد ہے کسی علم و کاروبار کے کرنے کا کوئی حق ہے۔ خدا کی نعمتوں میں دونوں کو برابر کا حصّہ ملا ہے اور دونوں کے حقوق مساوی ہیں جن پیشوں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ مردوں کے لئے مخصوص ہیں وہ سب کے سب عورتوں کے لئے بھی ہیں اور کسی قسم کی کوئی تفریق روا نہیں جس طرح مردوں میں کچھ آدمی مقابلتہً کمزور ہوتے ہیں اسی طریقہ سے عورتوں کو سمجھنا چاہئے کہ وہ کسی قدر جسمانی حالت میں کمزور ہیں مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ ان پیشوں سے محروم کردی جائیں۔"

**غلاموں اور پیشہ وروں کی تعلیم** افلاطون چونکہ حکمران خاندان میں سے تھا اس لئے وہ حکومت کے جذبات کو مغلوب نہیں کرسکا۔ اُس نے غلامی کے رواج کو جائز رکھا ہے اور پیشہ وروں کے لئے جو اس کے ملک میں زیادہ تر غیر ممالک کے لوگ تھے تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں کیا۔

**اصول تعلیم** افلاطون نے صحیح تعلیم کی تعریف اس طرح کی ہے کہ "تعلیم وہ عمدہ خصلت ہے جو بچوں میں خوشی، غمی، محبت و نفرت کے خیالات کو جوان کے دلوں میں پیدا ہوں ضبط اور اعتدال کے ساتھ ظاہر کرنے کی قدرت پیدا کرے۔" اس نے علم کو صرف علم کی غرض سے سیکھنے کا مشورہ دیا ہے اور جلب منفعت کا جو طمع سوفسطائیوں نے چڑھایا تھا اُس کی اس نے خوب قلعی کھولی ہے۔ تعلیم کے بارے میں اس کے اصول اختصار کے ساتھ حسب ذیل ہیں:

۱۔ اس نے سقراط کے اس اصول کی تائید کی ہے کہ اپنی جہالت اور نادانی اور ناواقفیت کے

مضرتوں کا احساس ہی سچے اور صحیح علم کی بنیاد ہی۔
۲۔ علم کا نظام تمدن سے واسطہ اور تعلق ہے۔ اس لئے نتیجۃً یہ ضروری ہے کہ تمام تعلیمی اصول سیاسات اور مدنیت کے پہلو بہ پہلو قایم کئے جائیں۔ سیاسی حالت کا تعلیم پر ہمیشہ اثر ہوتا ہے۔
۳۔ ہر علم کے درس کا مقصد یہی ہونا چاہیئے کہ طالب علم کی تربیت اچھی ہو اور اُس کی تعلیم درست ہو علم سیکھنے سے غرض جلب منفعت ہو یعنی علم کو دماغی اور ذہنی تربیت کے لئے سیکھنا چاہیئے اور اس کے سیکھتے وقت سونا چاندی پیدا کرنے کا خیال چھوڑ دینا چاہیئے۔
۴۔ جماعت اور اُس کے افراد میں جو باہمی تعلق ہے وہ افلاطوں کی رائے میں ایک تعلیمی مسئلہ ہے۔
۵۔ افلاطوں کا قول کہ تعلیم میں فنون لطیفہ مثل نقاشی، مصوری بھی سکھلانی چاہیئے اور یہ علوم و فنون ذہنی اور عملی تعلیم کے درمیان ربط قایم کرتے ہیں۔

## ارسطو ARISTOTLE

ارسطو جسے ڈینٹ Dante تمام اہل علم کا اُستاد کہتا ہی ایک طبیب کا بیٹا تھا ۳۸۴ سنہ (قبل مسیح) میں پیدا ہوا۔ اٹھارہ برس کی عمر تک اس کی تعلیم ایتھنز میں ہوئی جہاں وہ افلاطوں کے مدرسہ میں تحصیل علم کرتا تھا۔ افلاطوں کی وفات سے چار سال بعد ارسطو سکندر اعظم کا اتالیق مقرر ہوا۔ اس وقت سکندر تیرہ برس کا تھا۔ ارسطو تین سال تک اس عہدہ پر مامور رہا اس کے بعد وہ ایتھنز واپس آ گیا اور Lyceum (لائی سیم) میں افلاطوں کی درسگاہ کے مقابلہ میں اپنا مدرسہ جاری کیا۔ سکندر اعظم کی وفات پر (۳۲۳ سنہ قبل مسیح) مخالفین نے ارسطو کو ایتھنز چھوڑنے پر مجبور کیا اور وہ ایک ہی سال کے بعد فوت ہو گیا۔

ارسطو کے نزدیک تعلیم کا مقصد و منشا صرف ایک ہی ہے یعنی راحت۔ برخلاف

---

لے ہربرٹ اسپنسر کی رائے اس کے بالکل متضاد ہی اور صحیح طریقہ اس کے بین بین معلوم ہوتا ہی جس کا بیان آگے چل کر تشریح کے ساتھ آئے گا۔

افلاطون وسقراط کے، جو علم کو علم کی غرض سے حاصل کرنے کی مؤید اور طرفدار ہیں، ارسطو کہتا ہے کہ علم نیکی اور بھلائی کے پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ افلاطون کا قول ہے کہ علم کا کوئی صلہ نہیں ہونا چاہیئے لیکن ارسطو کے نزدیک علم کا صلہ قلب کی راحت ہے۔

ارسطو اہل اسپارٹا کو ہدایت کرتا ہے کہ "ہر کہ و مہ کے لئے ایک ہی قسم کا نصاب تعلیم مقرر کرو کیونکہ جب کہ تعلیم کی غایت ایک ہے تو تعلیم بھی یکساں ہونا چاہیئے اور اس کی ذمہ داری افراد پر نہیں بلکہ ملک پر ہو۔ سلطنت کا فرض ہے کہ تمام رعایا کی حقوق کی نگہداشت کرے۔"

ارسطو کے اصول کے مطابق تعلیم ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر ملک کے مفاد و مضرات مبنی ہیں اور اس لئے اس کو پرائیوٹ اشخاص کے ہاتھ میں نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اور وہ آگے چل کر یہ اضافہ کرتا ہے کہ صرف ان حکومتوں[1] میں جہاں کے انتظامات ناقص ہوں اور تعلیم کے متعلق غفلت برتی جاتی ہو خاندان کے بزرگوں اور سرپرستوں کا فرض ہے کہ اپنی انفرادی کوششوں سے اس کمی کو پورا کریں اور تعلیم کا بطور خود انتظام کریں۔

بچوں کی تعلیم کے متعلق ارسطو کہتا ہے کہ زمانہ ولادت سے قبل ہی اس کی فکر ہونا چاہیئے اور بچوں کے قوائے جسمانی کے خیال سے وہ پہلے اصول ازدواج کو طے کرتا ہے یعنی یہ کہ شادی کس عمر میں کرنا چاہیئے اور کیسے لوگوں کو کرنا چاہیئے۔ بچوں کے لئے وہ تجویز کرتا ہے کہ ان کی غذا دودھ ہو اور جسم کو بہت بہت حرکت ملتی رہے۔ بچوں کو زیادہ گرم نہیں رکھنا چاہیئے۔ پانچ برس کی عمر تک بچہ اس قابل نہیں ہوتا ہے کہ اس کو کسی قسم کی جبری ورزش پابندی کے ساتھ کرائی جائے اس بارے میں ارسطو کو افلاطون سے اتفاق ہے کہ کھیل میں بچے کو ان کاموں کی نقل کرنی چاہیئے جو اس کو بڑے ہو کر کرنا پڑیں گے۔ تعلیم کے اس اصول کو پسٹالوزی اور فروبیل نے بالتفصیل بیان کیا ہے۔ ارسطو کے نزدیک یہ غلطی ہے کہ بچوں کو رونے اور ہاتھ پیر مارنے سے روکا جاوے کیونکہ اس کے خیال میں اس سے نشو و نما میں مدد ملتی ہے۔ ارسطو خود بھی صاحب اولاد تھا اور وہ

[1] دنیا کی سلطنتوں میں سے اکثر سلطنتیں ارسطو کے اصول کی پابند ہیں اور رعایا کی ہر قسم کی تعلیم کا انتظام کرتی ہیں۔

اس کا طرفدار نہیں کہ بچّے دایوں کے سپرد کر دیئے جاویں جیسا کہ افلاطون نے تجویز کیا ہے (جس کے کوئی اولاد نہیں تھی) وہ کہتا ہے کہ سات برس کی عمر تک بچے گھر پر رہیں اور جہاں تک ممکن ہو نوکروں چاکروں کے ہاتھ میں نہ چھوڑے جاویں۔ باقاعدہ تعلیم سات برس کی عمر سے شروع ہونی چاہیئے اور مفصلہ ذیل مضامین سکھانے چاہئیں (۱) نوشت وخواند (۲) ورزش (۳) موسیقی (۴) نقشہ کشی۔ اس کے نزدیک جسم کی ترتیب دماغ کی تربیت سے مقدم ہے لہذا ورزش کرانا اور قواعد سکھانا اس عمر میں لازمی ہے اور وہ ورزش جسمانی کو دیگر دماغی مضامین کے ساتھ ایک علیحدہ مضمون قرار دینا چاہیئے جس کی باقاعدہ تعلیم ہو۔ زمانہ بلوغت کے تین سال کے بعد تک سخت ورزشیں بچوں کو نہیں کرنی چاہئیں۔ ارسطو نے اپنی اس رائے کی تائید میں نہایت دلچسپ اعداد پیش کئے ہیں اور یہ بتلایا ہے کہ وہ بچّے جو جوانی کی حالت میں اولمپک[له] Olympic کھیلوں میں ممتاز رہتے ہیں وہ آگے چل کر ورزش کے کھیلوں میں گر جاتے ہیں اور وہ لوگ بڑھ جاتے ہیں جنھوں نے نوجوانی میں سخت ورزشیں نہیں کیں۔

یہ مسئلہ ابھی تک طے نہیں ہوا کہ بچوں کو ایک معیار سے زیادہ کھیل کھلانے سے ان کی آیندہ صحت پر اچھا اثر پڑتا ہے یا برُا۔ میں نے خود بھی اس مسئلہ پر کافی غور نہیں کیا ہے مگر سرسری نگاہ ڈالنے پر بھی میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہمارے کالج کے وہ طلبا جو کرکٹ فٹ بال اور اور ہاکی کے اوّل ٹیم میں رہتے ہیں اُن کی جسمانی حالت کالج چھوڑنے کے بعد اور طلبا کے مقابلہ میں خاص طور پر ممتاز نہیں ہے اور اکثروں کو اس کے برعکس نتائج پیدا ہوئے ہیں۔

## اہلِ روما ROMANS

پچھلے بیان سے ظاہر ہے کہ یونان میں تعلیم کے دو بالکل جداگانہ طریقے رائج تھے یعنی ایک تو وہ جو اسپارٹا میں رائج تھا وہ بالکل یک رُخی اور جنگی تعلیم تھی اور اس میں قوائے ذہنی کی

[له] ایک قسم کے ورزشی کھیل جو قدیم یونان میں رائج تھے۔

تربیت کا کوئی لحاظ نہیں کیا گیا تھا۔ دوسرا وہ جو ایتھنز میں جاری تھا اور یہ ایک ایسا مکمل طریقہ تھا کہ اس میں جسم اور دماغ دونوں کے نشو ونما کا نہایت عمدگی کے ساتھ لحاظ رکھا گیا تھا۔

اہل روما نے اپنی سلطنت کے طولانی عہد میں ان دونوں طریقوں پر یکے بعد دیگرے عمل کیا۔ سلطنت جمہوری کے زمانہ سے فتح یونان تک اسپارٹا کے طریقہ تعلیم کو ترجیح دی گئی اور شہنشاہی کے زمانہ میں ایتھنز کا طریقہ رائج ہو گیا۔ اوائل میں اہل روما کے یہاں مذہبی پیشوا ہی معلم ہوتے تھے اور تعلیم تقریباً تمام تر جسمانی اور اخلاقی بلکہ قومی اور مذہبی ہوتی تھی ان کی تعلیم ان چیزوں پر مشتمل تھی۔ جسمانی ورزشیں، مذہبی گیت اور دوازدہ احکام (جو قانون آدم کہلاتے ہیں) کا مطالعہ۔

اس ملک نے جتنے شہ زور، نہایت شجاع، سخت پابند قانون اور غایت درجہ کے محبان وطن پیدا کئے وہ اسی قومی تعلیم کا نتیجہ تھے ان کی تعلیم کا مقصد محض جلب منفعت تھا اور اسے اصول اخلاق سے کچھ سروکار نہ تھا۔

اہل روما کی خانگی زندگی یونانیوں کی خانگی زندگی پر بدارج فوقیت رکھتی تھی، اس زمانہ کی عورتیں صنف نازک کا قابل قدر نمونہ تھیں۔ بیوی نہایت سلیقہ اور کفایت شعاری سے گھر کا انتظام کرتی اور یہ امر اس کی راحت قلبی کا موجب تھا کہ وہ اپنے بچوں کو بذات خود پرورش کرے۔ دلکش خودداری، مادرانہ محبت اور حسن خانہ داری ہی ان کی خوبیاں تھیں نہ کہ علم و فضل۔ فتح یونان کے بعد اہل روما کی سادگی میں ایک تغیر پیدا ہوا اور بقول ہوریس "مفتوح یونان نے فی الواقع اپنے فاتح کو تسخیر کر لیا"

علم دین کا مذاق تیسری صدی قبل مسیح کے اواخر میں پیدا ہو گیا تھا اور اہل روما یونانیوں کے اس طریقہ کا تتبع کرنے لگے کہ اپنے بچوں کو غلاموں کی نگرانی میں چھوڑ دیتے تھے معلوم ہوتا ہے کہ اہل روما نے تعلیم کو کبھی ایک ایسا کام نہیں تصور کیا جس کی ذمہ داری

قوم پر ہو اور سلطنت اس کا انتظام کرے۔ دوازدہ احکام میں بچوں کی تعلیم کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

سات سال کی عمر میں بچّہ کو مدرسوں میں بھیجدیا جاتا تھا جن کو پرائیویٹ طور سے مختلف لوگوں نے قائم کیا تھا۔ ابتدائی مدارس کے مدرسین کی کچھ زیادہ عزت و وقعت نہیں کی جاتی تھی اور علی العموم یہ ایسے لوگ ہوتے تھے جو اور پیشوں میں ناکام اور نامراد رہی ہوں۔ ان لوگوں کو اپنی عمر میں مال و دولت حاصل کرنے کا صرف اس طرح موقعہ مل سکتا تھا کہ اگر قسمت نے یاوری کی تو کسی شاہزادے کی اتالیقی کی خدمت مل گئی۔ مگر اعلیٰ طبقہ کے لوگ مدرسین کی سرپرستی عام طور سے نہیں کرتے تھے۔

بچہ کی تعلیم نوشت و خواند اور حساب کی تعلیم سے شروع ہوتی تھی۔ اور عام دستور تعلیم کا یہ تھا کہ حرف کی شکلیں اور صورتیں بتلانے سے پہلے اُن کے نام اور اُن کی ترتیب یاد کرائی جاتی تھی۔ حساب کی تعلیم میں Abacus[1] (ایک آلہ تعلیم حساب) کا استعمال بہت زیادہ کیا جاتا ہے۔

طلبہ کے اداب کا خاص طور سے خیال رکھا جاتا تھا اور تنبیہ یہ تھی کہ طالب علم مدرسہ کے کمرہ میں داخل ہوتے ہی اوستاد کو نہایت تعظیم کے ساتھ سلام کرے اور مودب ہو کر بیٹھے۔

ابتدائی تعلیم بارہ برس کی عمر میں ختم ہو جاتی تھی اور اوس کے بعد اعلیٰ تعلیم شروع ہوتی تھی۔ اعلیٰ تعلیم میں صرف و نحو السنہ یونانی، شعر، معانی و بیاں کی تعلیم ہوتی اور اسی کے ساتھ فصاحت و بلاغت کے اصول و قواعد، نظمیں اور فصیح و بلیغ تقریریں حفظ

---

[1] یہ ایک آلہ ہے جس کے ذریعہ سے گنتی، جمع و تفریق سکھلائی جاتی تھی۔ اس آلہ میں لوہے کی سلاخیں ہوتی ہیں، جن میں لٹو پردے ہوئے ہوتے ہیں اور لٹوؤں کو ایک طرف سے دوسری طرف لے جاکر شمار کرنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔

کرائی جاتی تھیں۔

## کوئنٹیلین QUINTILIAN

کوئنٹلین ملک اسپین میں تقریباً ۳۵ء میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ بچپن ہی میں اس کو شہر روما میں لے گیا اور وہاں اوس کو قانون کی تعلیم دلوائی۔ حصول تعلیم کے بعد کوئنٹلین نے اپنے وطن میں وکالت کا کام شروع کیا اور تھوڑے عرصہ تک وکالت کرنے کے بعد وہ پھر روما کو واپس چلا آیا۔ جہاں اُس نے اپنی زندگی کے بیس برس درس وتدریس کے مشغلہ میں گذارے۔ وہ پہلا معلم تھا جس کا سلطنت نے مشاہرہ مقرر کیا اور "پروفیسر خطابت" کا معزز خطاب عطا کیا۔ درس تدریس کا مشغلہ ترک کرنے پر اُس نے اپنی کتاب "اصول خطابت" شائع کی جس میں اس نے تعلیم کے اصول بیان کئے ہیں۔

کوئنٹلین کا یہ عقیدہ تھا کہ تعلیم بہت ابتدائی عمر سے شروع ہونا چاہیئے کیونکہ جو باتیں بچپن میں سکھلا دی جاتی ہیں وہ دل نشین ہوجاتی ہیں اور بڑے ہو کر کام میں آتی ہیں۔ کوئنٹلین کے نزدیک بچہ کے لئے دایہ کا انتخاب احتیاط کے ساتھ کرنا چاہیئے، وہ ایک نیک اور سمجھدار عورت ہو، اس کی ضرورت نہیں کہ وہ عالمہ وفاضلہ ہو لیکن یہ ضروری ہے کہ اس کی زبان نہایت صاف اور بے عیب ہو۔ بچہ کو پڑھنا لکھنا سکھانے میں پہلے حروف تہجی سکھلائے جائیں لیکن اون کے ناموں اور ترتیب سے پہلے اُن کی صورتیں بتانی چاہئیں کیونکہ کوئنٹلین کے نزدیک یہ بالکل غلط طریقہ ہے کہ حرفوں کی صورتوں سے پہلے ان کے نام اور ترتیب سکھائی جاے۔ وہ کہتا ہے کہ حروف ہاتھی دانت کے ہوں تو بہتر ہے کیونکہ بچوں کو اُنھیں ہاتھ میں لینے، دیکھنے اور نام لینے سے خوشی ہوتی ہے۔ لکھنا سکھلانے کے لئے کوئنٹلین کی راے ہے کہ حروف کو لکڑی کی تختی پر کھدوالیا جائے۔ وہ کہتا ہے کہ تعلیم میں جلد بازی نہیں کرنی چاہیئے۔ پڑھنا لکھنا

سیکھنے میں جس قدر نقصان جلدبازی سے ہوتا ہے اوس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ کوئنٹلین
جہاں اون باتوں سے منع کرتا ہے جو بچہ کے سکون خاطر اور امنگ میں رخنہ انداز ہوتی
ہیں وہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا کوئی اِس زمانہ کا معلم تقریر کررہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ
تعلیم کو بچّے کے لئے ایک کھیل بنادو۔ سوال بنا بنا کر پوچھو۔ جب وہ اپنا اچھا کام کرے
تو اُس کی تعریف کرو اور اگر وہ کوئی بات اپنے دل سے پیدا کرے تو اوس کا احساس
اور واقفیت اُسے ہونے دو۔

کوئنٹلین پرائیویٹ طور پر تعلیم پانے اور مدارس میں پڑھنے کا باہمی مقابلہ کرتا ہی
اور نہایت شدّومد کے ساتھ مدرسوں میں پڑھنے کی تائید کرتا ہے۔ وہ پہلے تو یہ دکھاتا ہی
کہ مدرسے بچّوں کی اخلاقی خرابی کے اس سے زیادہ موجب نہیں ہوتے جتنا ہم خود ہوتے
ہیں اُس کے الفاظ یہ ہیں "کیا ہم خود ہی اپنے بچوں کے اخلاق و عادات نہیں بگاڑتے؟
ہم نے ناز و تنعم کے ساتھہ پرورش کرکے اُن کے جسم کمزور کردیے۔ ہم نے اون کی تربیت
میں تساہل کیا جس کا نام لاڈ اور پیار رکھا ہے اور بچے کے ذہنی اور جسمانی دونوں قسم
کے قویٰ کمزور کردیے۔ اگر اس نے کوئی بے حیائی کی بات کہی تو ہم خوش ہوئے، اور
وہ لفظ جو شرفا میں روا نہیں رکھے جاتے جب اُس کی زبان سے نکلے تو ہم مسکرادیے
اور اوس کا مُنہ چوم لیا" اس کے بعد وہ نوکروں میں اُٹھنے بیٹھنے سے بتاکید منع کرتا ہے
اور یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ مدرسوں کو پرائیویٹ تعلیم پر ترجیح دینی چاہیئے کیونکہ علاوہ اس کے
وہ ان خطرات سے مبرّا ہوتے ہیں، مدرسہ میں بچّوں کو صحبت، رفاقت اور مقابلہ کی وجہ
سے تحریک پیدا ہوتی ہے۔

میری رائے میں کوئنٹلین نے مدرسوں کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی ہے
کوئنٹلین کہتا ہے کہ اوستاد بجائے ماں باپ کے ہے اور بچّوں کی تعلیم کا ذمہ دار ہی
اس کا یہ فرض ہے کہ ہر بچّہ کی خاص طبیعت کا خیال رکھے تعلیم کی غایت اخلاق فاضلہ ہیں

لہذا ضروری ہے کہ اوستاد بچوں سے میل جول رکھے اور اسی غرض سے وہ تجویز کرتا ہے کہ کھیل اور تفریح میں اوستاد بچوں کا شریک ہو۔ سزاے جسمانی کو قطعاً موقوف کردینا چاہیئے اور اوس کو کام بچہ کی غیرت اور اوستاد کے اثر سے لینا چاہیے۔

نصاب تعلیم میں کوئنٹلین نے موسیقی کو ترک نہیں کیا۔ اوس کی راے میں موسیقی سے واقفیت ضروری ہے تاکہ نظم میں وزن اور قافیہ کا احساس پیدا ہوجاے وہ یہ بھی کہتا ہے کہ تعلیم کے ساتھ بچے کسی ورزش گاہ میں بھی شریک ہوا کریں تاکہ ورزش جسمانی سے اُن کے قواے جسمانی کا نشوونما بھی ہوتا رہے۔

## پلوٹارک Plutarch

پلوٹارک سنہ ۴۶ع میں پیدا ہوا اور سنہ ۱۲۵ع میں وفات پائی۔ یہ قدیم زمانہ کا ایک بہت بڑا معلم، مورّخ اور حکیم گذرا ہے۔ اوس کی تعلیم ایتھنز میں ہوئی اور وہ روما میں فلسفہ اخلاق پڑھا کرتا تھا۔ اس کی کتاب موسوم بہ "حیات مشاہیر" بے انتہا علم و فضل تحقیق و تدقیق کا نتیجہ ہے۔ اسی کتاب پر مدت دراز تک روما میں خانگی اور مدرسہ کی تعلیم کی بنیاد قائم تھی اور شیکسپیر، ملٹن اور اس زمانہ کے بعض اور مصنفین کی بڑی بڑی تصانیف کا یہی کتاب ماخذ ہے۔ ہنری چہارم نے اوس کتاب کی نسبت یہ کہا ہے کہ "یہ کتاب مجھے ضمیر اور ایمان کا کام دیتی ہے۔ اوس نے بہت سے نیک مشورے اور عمدہ مقولے میری ذاتی اصلاح اور ملکی نظم ونسق کے متعلق وقتاً فوقتاً چپکے سے میرے کان میں پھونکے ہیں"۔

پلوٹارک خاندانی تعلیم کا بہت بڑا موید ہے۔ قدیم جمہوریت کے مٹ جانے کے بعد پلوٹارک نے ترقی کا مرکز خاندان کو قرار دیا ہے وہ کہتا ہے کہ تعلیم خانگی اور انفرادی ہونی چاہیئے۔ وہ مدرسوں کی ضرورت کو تسلیم نہیں کرتا مگر اعلیٰ تعلیم کے لئے۔ پس اس امر میں وہ کوئنٹلین سے متفق نہیں ہے۔

شعرا کے حق میں پلوٹارک نے بہ نسبت افلاطون کے زیادہ انصاف سے کام لیا ہے۔ وہ اس کے خلاف نہیں کہ شعرا کا کلام نہ پڑھا جائے بلکہ فقط یہ کہتا ہے کہ بے امتیاز نہیں پڑھنا چاہیئے۔ صرف اون شعرا کا کلام پڑھنا چاہیئے جن کے کلام سے لطف شعر کے ساتھ اخلاق صالحہ کی تعلیم بھی ملے۔

تعلیم کے باب میں جو مقام وہ خاندان کو دیتا ہے اوس کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ اس سے فرقۂ اناث کی مادی اور اخلاقی حیثیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ وہ عورت کو مالی امداد اور بچوں کی تعلیم و تربیت دونوں میں خاوند کا شریک قرار دیتا ہے اُس کے نزدیک ماں کو چاہیئے کہ وہ بچوں کی تعلیم میں ہاتھ بٹائے۔ لہذا لازم ہے کہ خود بھی تعلیم یافتہ ہو۔ مگر اس بارے میں وہ عورت کی فطری صفات پر بہ نسبت تحصیل علوم کے زیادہ زور دیتا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ "عورتوں کی صحبت سے اُن کی بھولی صورت، اُن کی شیریں کلامی اُن کی محبت اور اُن کی حساس طبیعت کی بدولت دل میں نرمی پیدا ہوتی ہے"

## اہل عرب

اس امر کے متعلق معلوم کرنے کے لئے کہ مسئلہ تعلیم کی نسبت اہل عرب کے کیا خیالات تھے بہت کم مواد موجود ہے۔ تعلیم کی تاریخ پر اہل یورپ میں جن لوگوں نے تصانیف کی ہیں اگرچہ وہ اپنی تصانیف میں اوائل زمانہ کے حالات درج کرتے ہیں لیکن اہل عرب کے زمانہ کو قطعاً چھوڑ جاتے ہیں غالباً اس کا سبب اُن کی ناواقفیت ہے اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جب یورپ میں احیائے علوم ہوا تو اہل یورپ نے سب سے پہلے عربوں ہی سے علوم حاصل کئے اور اپنی یونیورسٹیاں ہسپانیہ، مصر، بغداد، نیشاپور وغیرہ کی یونیورسٹیوں کے نمونہ پر بنائیں لہذا لازم ہے کہ اہل عرب میں مسئلہ تاریخ پر غور کرنے کے لئے ہم علمای مشرق اور اصل عربی تصانیف کی طرف رجوع کریں۔

جن لوگوں کی تاریخ پر نظر ہے ان کو یقیناً اس کا بخوبی علم ہوگا کہ جس زمانہ میں اسلامی یونیورسٹیاں معراج کمال پر پہونچی ہوئی تھیں عیسائی یورپ قعر جہالت میں سرنگوں تھا بلاشبہ وہاں تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری تھا۔ سینکڑوں استاد پڑھاتے اور ہزاروں طالب علم پڑھنے میں مصروف تھے۔ مگر یہ تعلیم ایسی تھی جس پر بہ لحاظ اکثر مشکل ہی سے تعلیم کا اطلاق ہو سکتا تھا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے۔ کہ جب یورپ میں احیائے علوم ہوا تو اہل یورپ نے سب سے پہلے عربوں ہی سے علوم حاصل کئے۔ اور اپنی یونیورسٹیاں ہسپانیہ، مصر، بغداد اور نیشاپور کے نمونے پر بنائیں لازم ہی کہ اہل عرب میں مسئلہ تاریخ پر غور کرنے کے لئے ہم علمائے مشرق اور اصل عربی تصانیف کی طرف رجوع کریں گو اس کا ایک مختصر بیان انسائیکلوپیڈیا متعلق مذہب و اخلاق کی پانچویں جلد میں بھی ملے گا۔

کلام پاک کی آیات مقدسہ اور احادیث نبوی میں جا بجا علم کی فضیلت اور تحصیل علم کی اہمیت پر زور دیا گیا ہی اور ارشاد نبوی ہی کہ "سب سے بیش بہا تحفہ جو باپ بیٹے کو دے سکتا ہی وہ عمدہ تعلیم ہی" اس نعمت سے غلاموں کو بھی محروم نہیں رکھا گیا۔ اسلام کی تعلیم کے مطابق غلاموں کو تعلیم دینا خاص طور پر مستحسن ہی۔ افلاطون نے اپنی جمہوریت کی اسکیم میں غلاموں کو شمار ہی نہیں کیا تھا۔ اور کوئنٹیلین نے بھی ان کا ذکر نہیں کیا پلوٹارک نے تو صاف صاف ہی کہدیا ہی کہ میرے اصول تعلیم فقط دولتمندوں ہی کے لئے ہیں اور غریب والدین کو چاہیئے کہ جو کچھ اُن سے بن پڑے اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے کریں۔ پس تاریخ تعلیم میں یہ پہلا موقع ہی کہ غلاموں کی تعلیم کی طرف توجہ کی گئی۔ سب سے پہلے توجہ دلانے والے عرب تھے۔

اوائل اسلام میں ابتدائی مدارس جو "کتاب" کہلاتے تھے مختلف شہروں میں

موجود تھے، متذکرہ بالا انسکالوپیڈیا میں اس قسم کے متعدد مدرسوں کی جو پہلی صدی ہجری کے نصف اول میں موجود تھے حوالے دیے گئے ہیں لکھنے کے لئے تختیاں استعمال ہوتی تھیں جو لوح کہلاتی تھیں جن لوگوں نے اول اول اسلام کی تعلیم پھیلائی انہوں نے جسمانی تربیت کو بھی ملحوظ رکھا تھا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مشورہ والدین کو یہ ہے:-

"اپنے بچوں کو تیراکی اور تیر افگنی سکھاؤ۔ شہسواری کی خوب مشق کراؤ اور عمدہ اور معقول اشعار یاد کراؤ۔"

عربوں میں مذاق شعر اس درجہ ترقی کر گیا تھا کہ ہم لطیفے کے طور سے کہہ سکتے ہیں کہ افلاطون کے وہ تمام شعراء جن کو اس نے اپنی ریپبلک سے شہر بدر کر دیا تھا انہوں نے عرب کی سرزمین میں پناہ لی۔

خلیفہ عبدالملک ابن مروان نے اپنے بیٹوں کے اتالیق کو یہ ہدایت کی کہ "ان کو تیرنا سکھاؤ اور کم خوابی کی عادت ڈالو۔" جاحظ اور ابن طوام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب کے نظام تعلیم میں تیراکی پر بہت توجہ کی جاتی تھی اور لکھنا سیکھنے سے پہلے حساب سکھلا دیا جاتا تھا جو کاروبار ضروری میں کام آتا ہے۔ ابتدائی مدارس میں نوشت و خواند اور حساب کے علاوہ ادب، قصص انبیا اور حکایات الصالحین بھی پڑھائی جاتی تھیں۔ اولاً بچوں کو شعرا کا منتخب کلام یاد کرایا جاتا تھا اور اس امر کے متعلق نہایت سختی سے ہدایت تھی کہ صرف اخلاقی نظمیں پڑھائی جائیں۔ ابن سینا کا قول ہے کہ شعر کی تعلیم ایسے مضمون سے شروع ہونی چاہیے جن میں ایسے مضامین ہوں مثلاً اخلاق کے فوائد، علم کی فضیلت، جہل کی مذمت، حماقت کی تضحیک اور ایسی نظمیں جن میں والدین کی اطاعت، صفات حمیدہ، اور اعمال صالحہ پر زور دیا گیا ہو

**امام غزالی**

ائمہ اسلام میں سے امام غزالی علیہ الرحمۃ نے اصول تعلیم پر سب سے زیادہ توجہ کی اور ان کا بیان امام صاحب نے اپنی مشہور تصنیف

احیاء العلوم میں ایک علیحدہ باب میں کیا ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ طوس میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد گو تعلیم یافتہ نہ تھے مگر ان کو اپنے بچہ کی تعلیم و تربیت کا بہت خیال تھا جس وقت ان کا انتقال ہونے لگا تو انہوں نے امام غزالی کو جو اس وقت احمد کے نام سے مشہور تھے اپنے ایک دوست کے سپرد کیا جنہوں نے دوستی کا پورا حق ادا کیا اور امام صاحب کی تعلیم پر خاص توجہ کی۔ نیشاپور میں امام غزالی نے امام الحرمین سے تعلیم حاصل کی جنہوں نے مدرسہ نقیبہ میں تعلیم پائی تھی۔ امام صاحب نے بہت سا وقت سفر میں صرف کیا اور جب وہ مقام خلیل میں پہنچے تو انہوں نے تین باتوں کا عہد کیا۔ (۱) کسی بادشاہ کے دربار میں نہ جاؤں گا (۲) کسی بادشاہ کا عطیہ نہ لونگا (۳) کسی سے مناظرہ نہ کرونگا۔

امام صاحب کی وفات ۵۰۵ھ ہجری میں ہوئی۔ امام صاحب سے یہ لطیفہ منسوب کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ وہ سفر میں جا رہے تھے کہ چوروں نے قافلہ پر حملہ کیا اور تمام مال اسباب لوٹ لیا۔ امام صاحب ڈاکوؤں کے سردار کے پاس گئے اور کہا میں اپنے اسباب و سامان میں سے صرف اپنی یادداشتوں کے مجموعے کو مانگتا ہوں کیونکہ میں نے ان ہی کے سنے اور یاد کرنے کے لئے یہ سفر اختیار کیا ہے۔ یہ سنکر وہ ہنس پڑا اور کہا کہ تم نے خاک سیکھا جب کہ تمہاری یہ حالت ہے کہ ایک کاغذ نہ رہا تو تم کورے رہ گئے۔ یہ کہکر اس نے وہ کاغذ واپس دیدئے۔ اس طعنہ آمیز فقرہ کا امام صاحب پر بڑا اثر ہوا اور وطن پہنچکر تمام یادداشتیں زبانی یاد کرنا شروع کیں۔

امام صاحب نے علوم کی تقسیم کی ہے۔ اور تشریح اس بات کی بھی کی ہے کہ کون سے علوم ہر شخص کے لئے مناسب ہیں اور کون سے علوم اختیاری ہیں۔ ان کے نزدیک علوم معاملہ ہر شخص کو سیکھنے چاہئیں علوم مکاشفہ ہر شخص کے لئے ضروری نہیں۔

علوم معاملہ کے بعض حصے کی تحصیل فرض کفایہ ہے اور بعض کی تحصیل مناسب نہیں ہے

مثلاً علم طب، علم حساب، اور علم ہئیت کا سیکھنا فرض کفایہ اور اُن کا سیکھنا فضیلت میں داخل ہے۔ علم جادو، طلسمات، شعبدات وغیرہ کا سیکھنا مناسب نہیں ہے۔ ہر علم میں ایک حصہ ایسا بھی ہوتا ہے جو کاملین کے لئے مخصوص ہے۔

علم کلام کا سیکھنا مناسب ہے مگر اس میں بہت سی غلط بحثیں بھی شامل ہو گئی ہیں جن کا سیکھنا فرض کفایہ میں نہیں ہے۔ علم الٰہیات اور فلسفہ علم کلام کا ایک جزو ہے۔ بعض علوم ایسے ہیں جن کا تھوڑا جاننا بُرا ہے اور بعض ایسے ہیں جن کا تھوڑا جاننا اچھا ہے۔

درس و تدریس میں شاگرد اور اُستاد دونوں کے فرائض ہیں۔ اور بغیر ان کی پابندی کے نقائص باقی رہ جاتے ہیں۔ شاگرد کے فرائض دس ہیں:۔

۱ - اخلاق رذیلہ اور اوصاف مذمومہ سے اپنے نفس کو پاک کرنا۔

۲ - اپنے تعلقات دنیوی کو کم کرنا اور ترک وطن کرنا (یہاں پر امام غزالی صاحب نے اپنے وطن کو چھوڑ کر دوسری جگہ تعلیم حاصل کرنے کی ہدایت کی ہے جس کی پابندی پورے طریقے پر انگلستان اور جرمنی میں دو مختلف پہلوؤں سے کی جاتی ہے انگلستان میں والدین اپنے بچوں کو بورڈنگ اسکولوں اور بورڈنگ کالجوں میں بھیجدیتے ہیں۔ اور جرمنی میں ہر طالب علم کے لئے مختلف یونیورسٹیوں کی سیاحت اور واقفیت ضروری سمجھی جاتی ہے)

۳ - معلم کے اوپر حکم چلانے کا خیال نہ کرے بلکہ محکوم بنکر رہے جیسے نادان مریض طبیب حاذق کے سامنے ہوتا ہے۔ آجکل ہمارے ملک میں پولٹیکل جمہوریت اور حریت تعلیمی درسگاہوں میں اپنا پورا اثر کر گئی ہے۔ اور اگر امام غزالیؒ آج کل اس زمانے میں موجود ہوتے تو اُن کو حالات دیکھکر بہت زیادہ حیرت ہوتی)

۴ - ابتدائے تعلیم میں اختلافات کے اوپر نظر ڈالنا نہیں چاہئے۔ ایسا کرنے سے عقل حیرت میں پڑجاتی ہے۔ رائے پریشان ہو جاتی ہے اور جب طالب علم کی عقل

حیرت میں پڑے گی تو وہ عقل اندھی ہو جائے گی۔

۵۔ پسندیدہ علوم میں سے ہر ایک علم کے اصول سے تھوڑی واقفیت پیدا کرے

۶۔ بلا ترتیب کسی علم میں غور و خوض نہ کرے کیونکہ عمر تمام علوم کے سیکھنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ اور طالب علم کو چاہیئے کہ ساری قوت اس علم میں صرف کرے جس کو وہ سب سے ضروری سمجھتا ہے (ان پانچویں اور چھٹے اصول میں امام صاحب نے وضاحت کے ساتھ اس اصول کی تائید کی۔ علوم سیکھنے میں ہر شخص کو چاہیئے کہ:

۷۔ کسی فن کو جب تک پورا نہ کرے اور ماہر نہ ہو جائے اس وقت تک قدم آگے نہ بڑھائے (یہ وہ اصول ہے جس کی کہ جدید تعلیم میں بہت کم پیروی کی جاتی ہے اور موجودہ زمانہ میں اس اصول کا موجد روسو اور پستالوزی کو کہا جاتا ہے حالانکہ امام غزالی نے ایک ہزار برس پیشتر اس کی تائید کی تھی اور تمام اسلامی مدارس میں اس اصول کی سختی کے ساتھ پابندی کی جاتی رہی ہے)

۸۔ علم کا مقصد و منشاء اپنے باطن کو آراستہ کرنا قرار دے نہ کہ تحصیل مال و منال و جاہ و حشمت (یعنی جو کچھ علم ہم مروجہ اصطلاح کے لحاظ سے حاصل کرتے ہیں اور اس سے جو کچھ مقصد ہمارا ہوتا ہے امام غزالی کی اصطلاح میں ہم اس کو علم کے نام سے تعبیر ہی نہیں کر سکتے)

۹۔ علوم کی باہمی نسبت کو جاننا چاہیئے تاکہ ہر علم کی اس کی شان کے مطابق قدر کر سکے

۱۰۔ طالب علم کو چاہیئے کہ وہ ان ذرائع پر حاوی ہو جس سے بہترین علوم حاصل ہو سکیں

امام صاحب کے نزدیک معلم کے فرائض آٹھ ہیں:۔

۱۔ طالب علم کے اوپر شفقت کرنا اور اس کو اپنے بیٹے کی برابر سمجھنا۔

۲ - علم کے پڑھانے کے لئے کسی اُجرت یا معاوضہ یا شکریہ کا خیال و قصد نہ کرے
۳ - شاگرد کی خیر خواہی میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑے۔
۴ - شاگرد کو اگر جھڑکی دینی ہو تو جہاں تک ہو سکے اشارے اور کنایہ میں تادیب کرے
۵ - ایک علم کا پڑھانے والا اُستاد دوسرے علم کی توہین اور ناقدری طالب علم کے ذہن میں نہ بٹھلائے۔
۶ - اُستاد کو چاہئے کہ طالب علم کی عقل اور ذہن کا پورا اندازہ کرے اور اُس کو اسی قدر پڑھائے جو اُس کے فہم میں آسکے۔
۷ - کم درجہ کے شاگردوں کو جو باتیں بتلائی جائیں وہ اس طرح بتلائی جائیں کہ شاگردوں کو یہ خیال پیدا نہ ہو کہ اُستاد نے کچھ باریکیاں اُن سے مخفی رکھی ہیں۔
۸ - معلم جو علم پڑھائے اُس کا خود بھی پورا علم رکھتا ہو۔

## قرونِ وسطیٰ Middle Ages

سلطنتِ روما کے زوال اور زمانہ احیاے علوم (نیز سولویں صدی کے مشہور دورِ اصلاح) کے درمیانی عہد کو قرونِ وسطیٰ کہتے ہیں۔ اس عہد کی تعلیم کی خصوصیت یہ تھی کہ مذہبی خیالات کو غلبہ تام حاصل تھا۔ تعلیم و تربیت کی غرض و غایت حیات مابعد الممات کے لئے تیاری تھی نہ کہ اس دنیا کی زندگی کے لئے۔ اس زمانہ میں تعلیم استدلالی اور اصولی نہ تھی بلکہ استنادی[1] تھی۔ تعلیم کا مفہوم صرف قوّتِ حافظہ کو ترقی دینا اور آزادانہ تحقیق اور دلائل براہین کی تعلیم کو پامال کرنا سمجھا جاتا تھا۔

اس عہد کو Scholisticism (یعنی اہل مدرسہ کا عہد) بھی کہتے ہیں۔ اس

---

[1] یعنی کسی مسئلہ کے ثبوت میں بجائے دلائل کے صرف اقوال کو پیش کرنا۔ Authority

عہد کی خصوصیت منطقی استدلال تھا یعنی معلوم قضایا سے بغیر ان کی صحت کو پرکھے نتائج اخذ کرنا۔ الفاظ پر نظر تھی نہ کہ حقائق اشیا پر اور تعلیم کا مدار ارسطو کی منطق پر تھا۔ لاک نے اس زمانے کا ذکر یوں کیا ہے کہ "اس عہد کی جمودیت کو دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے انسان کو ایک دو پایہ جانور بنایا اور یہ بات ارسطو کے لئے چھوڑ دی کہ اُسے حیوان ناطق بنا دے۔

اس عہد میں تعلیم مفصلہ ذیل سات مضامین پر مشتمل تھی یعنی صرف[1] و نحو[2] منطق معنی و بیان[3]، موسیقی، حساب[4]، اقلیدس[5]، علم ہیئت۔ صرف و نحو سے قواعد زبان کا حفظ یاد کر لینا مقصود تھا نہ ان کا استعمال تعلیم و تعلم لاطینی زبان میں ہوتا تھا حساب صرف اس غرض سے سکھایا جاتا تھا کہ مذہبی تہواروں کا حساب لگایا جا سکے۔ تعلیم میں بڑی سختی برتی جاتی تھی ۱۳۶۳ء میں اس کی ممانعت ہوگئی تھی کہ شاگرد بنچوں یا کرسیوں پر بیٹھیں کیونکہ اونچے بیٹھنے سے غرور و تکبر پیدا ہوتا ہے۔ اطاعت کرانے کے لئے جسمانی سزا سے جا بیجا کام لیا جاتا تھا۔

قرون وسطیٰ میں صلیبی لڑائیوں کی بدولت ایک خاص طبقہ امرائے جنگی Knights (مجاہدین) کا قائم ہوگیا تھا جس نے تعلیم و تربیت کے ایک ایسے طریقے کو اختیار کیا جو کلیسا کے طریق مروجہ سے بالکل مختلف تھا۔ یہ تعلیم تین مساوی حصوں میں منقسم تھی۔ جس بچے کو نائٹ (مجاہد) بننا ہوتا تھا وہ اولاً سات برس تک اپنے آبائی قلعہ میں اپنی ماں کی نگرانی میں رہتا تھا۔ اس کے بعد کسی دوسرے نائٹ کے پاس جس سے اس کے والدین کے مراسم دوستی ہوتے تھے بھیجدیا جاتا تھا اور وہاں

---

لے یعنی کبرے کی تحقیق کئے بغیر جس پر نتیجہ منحصر ہوتا ہے نتیجہ کو صحیح سمجھ لینا۔ مثلاً زندگی کے لئے پانی ضروری ہے، چاند میں پانی نہیں ہے۔ اس لئے چاند میں زندگانی محال ہے۔ اس میں کبریٰ ہے کہ زندگی کے لئے پانی ضروری ہے اور نتیجے کی صحت اس کبرے کی صحت پر منحصر ہے ۱۲

موسیقی، شطرنج اور نائٹوں کے آداب و اخلاق سیکھتا تھا۔ چودہ برس کی عمر میں وہ اسکوائر یا مصاحب بن جاتا تھا اور اس وقت سے اس کی جسمانی اور فوجی تعلیم زیادہ جفاکشی کی ہو جاتی تھی۔ وہ ہر موقع پر خواہ شکار ہو یا ٹورنامنٹ یا لڑائی کا گھمسان ہو نہایت وفاداری اور جاں نثاری کے ساتھ اپنے آقا کے ہم رکاب رہتا تھا۔ سات سال کی طولانی مدت امیدواری کے بعد اگر وہ قابل ثابت ہوتا تھا تو اکیس برس کی عمر میں بڑے تزک و احتشام کے ساتھ باضابطہ طور پر نائٹ کے درجے پر معزز و ممتاز کیا جاتا تھا۔ اس موقع پر اس کو عہد کرنا پڑتا تھا کہ وہ ہمیشہ سچ بولے گا۔ حق کی حمایت کریگا اور صنفِ نازک کا احترام کرے گا اور کفار مشرق (یعنی مسلمانوں) کے مقابلے میں تلوار اٹھائے گا۔ تب اسے مہمیز اور زرہ بکتر عطا ہوتی تھی۔ نائٹ کی تعلیم میں موسیقی اور شعر کے سوائے کوئی اور جزو ذہنی تربیت کا نہیں ہوتا تھا اور موجودہ زمانے کے اخلاق و عادات میں اس سیدھی سادھی تعلیم و تربیت کے نمایاں آثار موجود ہیں۔

## یونیورسٹیوں کی ابتدائی تاریخ

قرون وسطے نے اصول تعلیم میں کوئی بڑا اضافہ نہیں کیا لیکن یہ عہد اس لحاظ سے ہمیشہ یادگار رہے گا کہ اس میں یونیورسٹیاں قائم ہوئیں اور اس طرح پر تعلیم نے حقیقتاً بڑی ترقی کی۔ افلاطون کا دارالعلم، ارسطو کی درسگاہ اور کوئنٹیلین کا مدرسہ یونیورسٹیاں نہیں تھیں بلکہ پرائیوٹ تعلیم گاہیں تھیں، جن میں کسی مضمون یا مضامین پر جن کے ساتھ ان کے بانیوں کو دلچسپی ہوتی تھی، لکچر ہوا کرتے تھے اور ایک درسگاہ میں ایک ہی مضمون پر لکچر ہوتے تھے طلبا کو مختلف مضامین پڑھنے کے لئے مختلف تعلیم گاہوں میں جانا پڑتا تھا۔

آہستہ آہستہ اسکول قائم ہوتے گئے، جن میں ایک سے زیادہ مضمون پڑھانے والے معلم مقررہ تنخواہوں پر مامور کئے جاتے تھے۔ یہ مدرسے امرا کی فیاضی کی بدولت

قائم ہوتے تھے۔ اہل روما کے اواخر عہد میں یہ مدرسے پیدا ہو گئے تھے۔ اور دوسری تیسری صدی ہجری میں علوم اسلام کے مختلف مرکزوں مثلاً نیشاپور، بغداد، دمشق قاہرہ میں زیادہ تعداد میں پائے جانے لگے تھے۔

موجودہ زمانے میں یونیورسٹی کا مفہوم اساتذہ اور طلبا کی وہ جماعت ہے جس کی ہئیت اجتماعی کو سلطنت یا کلیسا یا دونوں نے بذریعہ خاص احکام کے تسلیم کر لیا ہو اس سے بہت پہلے کہ قانونی طور پر اُن کا وجود تسلیم کیا جائے اور انہیں خاص مراعات حاصل ہوں اکثر یونیورسٹیاں حقیقت میں موجود تھیں اور شد و مد کے ساتھ اپنا کام کر رہی تھیں۔ بغداد، نیشاپور اور قاہرہ کے مختلف مدرسوں کے حالات پڑھ کر صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض مدرسے فی الواقع یونیورسٹی کے درجے کو پہنچ چکے تھے، گو یہ طے کرنا مشکل ہے کہ آیا وہ اس تعریف کے مطابق یونیورسٹیاں تھیں جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ یونیورسٹی ایسی چیز نہیں جو ایک ہی دفعہ پیدا ہو گئی ہو بلکہ اس نے آہستہ آہستہ اور صدیوں میں نشوونما پائی ہے اور اسی لئے یہ بتانا مشکل ہے کہ کونسی تعلیم گاہ دنیا کی سب سے پہلی یونیورسٹی ہے۔ مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نظامیہ بغداد جسے نظام الملک طوسی نے جو الپ ارسلان اور ملک شاہ سلجوقی کا وزیر اعظم تھا قائم کیا تھا۔ لفظ یونیورسٹی کے موجودہ مفہوم کے مطابق ضرور ایک یونیورسٹی تھا اور اسی کے نمونے پر قریباً ڈھائی سو سال بعد پیرس کی یونیورسٹی بنائی گئی۔

اسلامی یونیورسٹیاں سرکاری یونیورسٹیاں تھیں۔ اُن کے پرنسپل اور پروفیسر فقط پرنسپل اور پروفیسر ہی نہ تھے بلکہ سلطنت کی طرف سے مفتی اور قاضی کے جلیل القدر عہدوں پر بھی ساتھ کے ساتھ ممتاز ہوتے تھے۔

نظامیہ بغداد کا ۴۵۹ھ میں اسی شان و شوکت کے ساتھ افتتاح ہوا جیسی کہ موجودہ زمانہ میں دیکھنے میں آتی ہے۔ اور جس سے ان لوگوں کو جو صحیح معنی میں عالم

اور متقی تھے صدمہ پہنچا۔ نظامیہ کے قائم ہونے پر علمائے ماوراالنہر نے ایک ماتمی مجلس منعقد کی اور اس پر اظہار حزن و ملال کیا گیا کہ اس بدعت کا یہ نتیجہ ہوگا کہ لوگ علم کو علم کی غرض سے تحصیل کرنا چھوڑ دینگے اور تحصیل علم کی غایت حصول جاہ اور طلب شہرت ہو جائیگی۔ نظامیہ بغداد اور مثل اس کے دیگر دارالعلوم میں طلبا سے تعلیم کی اجرت یا خوراک۔ مکان اور علاج معالجہ کا خرچ نہیں لیا جاتا تھا۔ طلبا کو کتابیں کاغذ، قلم، دوات یونیورسٹی کی طرف سے دی جاتی تھیں اور ایک مقررہ رقم بھی جیب خرچ کے لئے ماہوار ملتی تھی۔

یہ اسلامی روایت فرانس میں ابھی تک موجود ہے کہ تعلیم ابتدا سے انتہا تک مفت دی جاتی ہے۔ ان قدیم دارالعلوم میں طالب علموں کے لئے دارالاقامہ (بورڈنگ) قائم تھے اور ہر ملک کے طلبا علیحدہ علیحدہ حصوں میں اپنے ہم وطن استادوں کی نگرانی میں رکھے جاتے تھے۔ یہ طریقے الازہر کی یونیورسٹی میں اب تک رائج ہیں لیکن افسوس کہ مدد نامناسب طریقے سے دی جاتی ہے جو طلبا میں خودداری اور غیرتمندی کو کلیتہً زائل کر دیتا ہے۔

بغداد کی یونیورسٹی کے نمونے پر دمشق، حلب، قاہرہ، غرناطہ اور قسطنطنیہ میں یونیورسٹیاں قائم کی گئیں۔

پہلا فوجی مدرسہ خلیفہ عبدالمومن نے قائم کیا جس میں نوشت و خواند اور ریاضی کے علاوہ شہسواری، تیراندازی، نیزہ بازی، کشتیبانی اور تیراکی سکھائی جاتی تھی اس مدرسہ میں تین ہزار لڑکے تھے اور بحری اور بری دونوں قسم کی مصنوعی جنگ ان میں کرائی جاتی تھی۔ فتح سسلی کے بعد مسلمانوں کا تہذیب و تمدن جزیرہ سسلی اور اس کی درسگاہوں میں بھی پھیل گیا، اور عیسائی طلبا، غرناطہ، سلیمانیہ اور طلیطلہ کی یونیورسٹیوں میں بھی بتعداد کثیر شریک ہونے لگے اور آخرکار ان ہی لوگوں نے

علوم و حکمت عربی کی علمی اور فلسفی کتابوں کو لاطینی میں ترجمہ کر کے مسیحی یورپ میں سب سے پہلے یونیورسٹی سلرنو میں جو سسلی کے دوسری جانب واقع ہے قائم کی اور یہ فقط طبّی تعلیم کے لئے مخصوص تھی۔ بولون کی یونیورسٹی بارہویں صدی کے وسط میں قائم ہوئی اور اس کے بعد پیرس کی یونیورسٹی قائم ہوئی عہ

## احیاے علوم کا عہد

ہم یہ بیان کر آئے ہیں کہ قرون وسطےٰ کی تعلیم کی خصوصیت یہ تھی کہ امراے جنگی Knights اور علماے دین کے احکامات کی بے چون و چرا متابعت کی جاتی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس زمانہ میں نہ تخیل کی خلاقی تھی اور نہ خیالات میں جدت، نہ علوم حقائق تک پہنچے، نہ اصلی ماخذوں کی چھان بین کی گئی۔ علوم طبعی میں فقط ارسطو کا حوالہ دیدیا جاتا تھا۔ ہر ایک چیز کی دلیل میں صرف قال الشیخ چسپاں کر دیا جاتا ہے۔

تعلیم کے لئے جو ڈھرا پڑ گیا تھا اُسکی نہایت سختی کے ساتھ پابندی کی جاتی تھی جو طالب علم کی قواے ذہنی کو پامال کرنے والی تھی۔ شاگرد پر جبر تھا کہ جو بات اُستاد کے منہ سے نکلے اس پر غلاموں کی طرح آمنا و صدقنا کہے اور بے چون و چرا تسلیم کرے اور اگر وہ اس سے انحراف کرتا تو اُسے سخت جسمانی سزا دی جاتی تھی۔

۱۴۵۳ء میں جب مسلمانوں نے قسطنطنیہ فتح کیا ہے تو گویا یونانیوں اور روما کے علمی خزانہ یورپ کے لئے کھل گئے، دماغ کی نشو و نما کے لئے سامان مہیا ہوئے کلیسا کی ملّایانہ تعلیم سے بے اطمینانی پیدا ہو گئی اور دماغ کلیسا کی حکومت سے آزاد ہونا شروع ہوا۔ بارود کی ایجاد نے نائٹوں کا اثر و طاقت مٹا دی جس سے ایک مفید اور عظیم الشان تغیر نظام تمدن میں پیدا ہو گیا۔ امریکہ کے دریافت ہونے اور ہندوستان

عہ جو صاحب اس مضمون پر خاص طور پر مطالعہ کرنا چاہیں وہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا ایک نہایت دلچسپ مضمون ملاحظہ کریں ۱۲

کا بحری راستہ معلوم ہوجانے سے علم کے دائرہ میں وسعت پیدا ہوئی اور تجارتی کاروبار میں ترقی۔ جس سے ہمتیں بلند اور حوصلے بڑھ گئے لیکن سب سے بڑی چیز چھاپے کی ایجاد تھی جس نے نہایت تکلیف دہ اور نہایت گراں طریقہ نقل کو مٹا دیا اس زمانے میں دستی کتابیں بمقابلے چھپی ہوئی کتابوں کے ملنی بھی دشوار تھیں اور قیمت بھی زیادہ ہوتی تھی۔ اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ کتابیں عام لوگوں کی دست رس سے باہر تھیں۔

ان میں سے ہر ایک واقعہ گویا جر ثقیل کا ایک عمل تھا جو دنیا کو بلند اور بلند تر کرتا گیا۔ افلاطون، ارسطو، کونٹیلین، اور پلوٹارک کی تصانیف کی اشاعت نے قرون وسطےٰ کے اصول تعلیم کو درہم برہم کر دیا۔ اب لبرل (آزاد) تعلیم علم کو علم کی غرض سے پڑھنے اور حقائق اشیا کے جاننے، بچوں سے بملائمت پیش آنے اور خودداری اور غیر تمندی پر زور دیا جانے لگا۔

احیائے علوم یا علم کو علم کی غرض سے حاصل کرنے کا خیال اور جوش یونیورسٹیوں یا کلیسا یا شاہی درباروں نے پیدا نہیں کیا بلکہ یہ نتیجہ تھا بعض بادشاہوں کے اثر اور پر جوش تعلیم کے مناودں مثلاً اگریکولا Agricola راخلن اراس مس استورودم کی مساعی جمیلہ کا۔

اس جوش نے مختلف ممالک میں مختلف صورتیں اختیار کیں۔ اسکی ابتدا اٹلی میں ہوئی جہاں اس تعلیم کی غایت یہ قرار دی گئی کہ طالب علموں کو کلیسا اور سلطنت کی خدمت کے لئے تیار کیا جائے۔ جرمنی میں اس کی بدولت راہبوں سے سخت مناقشہ پیدا ہوا لیکن سٹورودم کا منشا ہوا

## دور اصلاح

احیائے علوم Renaissane کی تحریک صرف خواص سے مخصوص تھی۔ اس کی بدولت چونکہ یونانی اور لاطینی علم ادب کی اشاعت

ہوئی اور علم کو علم کی غرض سے پڑھنے کے خیال کی بنیاد رکھی گئی اس لئے احیائے علوم
کی تحریک خواص سے مخصوص تھی جس کا عوام پر کوئی اثر نہ تھا لیکن دور اصلاح
Reformation کی ممتاز خصوصیت یہ تھی کہ اندھا دھند تقلید کی مخالفت کی جائے
اور ہر فرد اپنی عقل سے کام لے۔ احیائے علوم گویا ارتقا تھا اور دور اصلاح ایک انقلاب
اس انقلاب کا ایک اثر تو یہ ہوا کہ انجیل کے تراجم مختلف زبانوں میں ہوے اور وہ
نصاب تعلیم میں داخل ہو گئی۔ یا یوں کہئے کہ "احیائے علوم" کی بدولت ارسطو
کی منطق سے چھٹکارا ہوا اور دماغی تربیت میں آزادی ملی اور "دور اصلاح" کی بدولت
سوشیل، مذہبی، تمدنی اور جسمانی غلامی سے انسان کو آزادی نصیب ہوئی اور
روایات قدیمہ و توہمات باطلہ کی جکڑ بندیوں سے لوگ آزاد ہوئے۔

**لوتھر** لوتھر ۱۴۸۳ء میں آئس لیبن Eisleban میں پیدا ہوا۔
اس کا باپ ایک غریب کان کن تھا گھر پر تعلیم و تربیت میں نہایت
سختی سے کام لیا گیا اور بعض اوقات اس کا باپ اُسے ادنےٰ قصور پر اس قدر
پیٹتا تھا کہ خون تک نکل آتا تھا۔ لوتھر کا اپنا بیان ہے کہ مکتب میں ایک ہی دن میں
پندرہ پندرہ دفعہ میرے بید لگے ہیں۔ اس کے باپ کا منشا یہ تھا کہ اسے قانون
کی تعلیم دلوائے مگر لوتھر نے اپنے لئے رہبانیت کی زندگی پسند کی ۱۵۰۸ء میں وہ
وٹن برگ Wittenberg کی یونیورسٹی میں دینیات کا پروفیسر مقرر ہو گیا۔
۱۵۱۱ء میں وہ روما گیا اور وہاں اُس نے بچشم خود دیکھا کہ تقدس مآب جناب پوپ
کے دربار میں کتنی بد اخلاقی، عیش پرستی اور عیاشی ہوتی ہے۔ اس حالت کا اثر اس کے
قلب پر پڑا۔ چنانچہ روم سے واپسی پر ۱۵۱۷ء میں اُس نے اپنی کتاب شائع کی جس میں
علی الاعلان بیان کیا کہ خدا کے سوائے اور کوئی عفو گناہ نہیں کر سکتا۔ یہ تعلیم مذہب
رومن کیتھلک کے عقائد کے سراسر خلاف تھی۔ چنانچہ یہ کہا جاتا ہے کہ دور اصلاح

کی بنیاد اس ایک واقعہ سے پڑی اور یہی اس کی ابتدا سمجھی جاتی ہے۔ اس واقعہ کے تھوڑے ہی عرصہ بعد کلیسا سے لوتھر کا کھلم کھلا بگاڑ ہو گیا۔ اس کی کتاب شائع ہونے کے بعد جو جو تکالیف اُس کو پہنچیں اور جو جو اذیتیں اُس کو مخالفین نے پہنچائیں اُس نے نہایت پامردی اور استقامت سے ان کا مقابلہ کیا۔ لوتھر نے انجیل کا جرمنی زبان میں ترجمہ کیا جس سے عام لوگوں کو اس کے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔

لوتھر نے بکمال دانشمندی ملکی فلاح و بہبود اور پبلک میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے اس امر پر خاص طور سے زور دیا ہے کہ گھروں کی خانگی زندگی Home-life میں ڈسپلن قائم ہو۔ وہ اس طریقے سے استدلال کرتا ہے:-

"..... شہر کیا ہے؟ شہر خاندانوں کے مجموعے کا نام ہے اور شہر کی حکومت"
"اور انتظام اُس وقت تک درست نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ گھروں اور"
"خاندانوں میں خانگی حکومت اور انتظام اور ڈسپلن صحیح اصول پر"
"قائم نہو۔ اور اُس گھرانے کا ہر ایک بچہ، ہر ایک ملازم، ہر ایک فرد"
"اطاعت اور فرماں برداری کے اصول پر پابند نہو۔ اسی طرح شہروں،"
"قصبوں اور گاؤں کے مجموعے کا نام ضلع ہے۔ جب خاندانوں میں"
"بد انتظامی ہو تو ضلع کا انتظام کیونکر درست حالت میں ہو سکتا ہے اور"
"اس بد انتظامی کا نتیجہ چوری اور سینہ زوری، جبر اور تعدی، قتل و غارت"
"کے سوا اور کیا ہو گا....."

اسی طرز استدلال سے لوتھر نے صوبوں اور ملکوں کے انتظام پر اظہار خیال کیا ہے اور اس بات کے اچھی طرح ذہن نشین کرنے کی کوشش کی ہے کہ جو لوگ چھوٹی چھوٹی جماعتوں اور گروہوں کے انتظامات کرنے کی قابلیت نہیں رکھتے وہ

ہرگز اس کے اہل نہیں ہو سکتے کہ کسی بڑی جماعت یا اعلیٰ درجے کے نظام حکومت کو بکامیابی چلا سکیں۔ اسی اصول پر میں کالجوں کے طلبہ سے اور بالخصوص اپنے قومی کالجوں کے طلبہ سے اپیل کرونگا کہ آپ سب سے پہلے اپنے کالج کی سوسائیٹیوں کو اچھے طریقے اور صحیح اصول پر چلانے کی مہارت پیدا کیجئے تاکہ آئندہ چل کر آپ جب کاروبار زندگی میں داخل ہوں تو اپنے فرائض کو بخوبی خوش اسلوبی انجام دینے ملک اور قوم کی فلاح اور بہبود کے کام بہتر طریقے سے کرنے، سوسائیٹیوں اور جماعتوں کو کامیاب بنانے اور ملک کی حکومت میں جو آپ کا حصہ ہو اُس کو عمدہ طریقے سے انجام دینے کی قابلیت حاصل کر سکیں۔ یاد رکھئے کہ وہ قوم جو خود اپنی قومی انجمنوں، اسکولوں، کالجوں اور مختلف درس گاہوں کو خوبی، و خوش اسلوبی کے ساتھ نہیں چلا سکتی وہ ہرگز ہمارے ملک کی حکومت میں معقول حصہ لینے کی اہلیت نہیں رکھتی۔)

لوتھر نے جب کلیسا کا کام شروع کیا تو اُس کو سب سے پہلے مدرسوں کی اصلاح کا احساس ہوا اور مسئلہ تعلیم کے متعلق اُس کے جو خیالات تھے وہ اُس نے اُس خط میں ظاہر کئے ہیں جو جرمنی کے واضعانِ قانون اور مجسٹریٹوں کے نام اُس نے لکھا تھا جس میں ان الفاظ کے ساتھ جبریہ اور مفت تعلیم کی استدعا کی تھی۔

"ہر سال ہر شہر پر سڑکیں بنانے، ہتھیار خریدنے اور سپاہیوں کے تیار کرنے کا ایک صرف کثیر پڑتا ہے کیا وجہ ہے کہ ہر سال اتنی رقم معلمین کی مصارف کے لئے نہ بچائی جائے۔ شہر کی خوش اسلوبی کا انحصار قدرتی زرخیزی، شہر پناہ کی مضبوطی، محلات کی نفاست اور سلاح خانوں کی کثرت اسلحہ پر نہیں ہے بلکہ سب سے زیادہ ملک کا امن اور قوت باشندگان شہر کی عمدہ تعلیم اور تربیت پر موقوف اور منحصر ہے جس کے ذریعے سے تعلیم یافتہ اور معقول اور سنجیدہ افراد شہر پیدا

ہوتے ہیں۔"

اس کے بعد لوتھر نے لکھا ہے کہ اگر حکام اپنی تندرست رعایا کو لڑائی کے وقت اسلحہ کے استعمال اور فوجی خدمت کے واسطے مجبور کر سکتے ہیں تو اُن کو اور زیادہ اپنی رعایا کو مجبور کرنا چاہیئے کہ وہ اپنے بچوں کو مدرسہ میں بھیجیں کیونکہ یہ ایک بڑی خوفناک جنگ کا معاملہ ہے جو جہالت کے شیطان سے ہوتی ہے جس کی وجہ سے گھر ویران اور باشندے مفلس ہوئے جاتے ہیں۔"

لوتھر کے نزدیک مدرسوں کے مصارف خزانہ عامہ سے ادا ہونے چاہئیں لیکن وہ جبریہ اور مفت تعلیم کی ان مشکلات سے بخوبی واقف تھا جو والدین کی نارضامندی اور اُستادوں کی ضرورت کی شکل میں پیش آتی ہیں۔ لوتھر خود واعظ تھا اور اس نے اپنے وعظوں میں والدین کو اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ بچوں کو سرکاری مدرسوں میں تعلیم دلانا اُن کا اخلاقی فرض ہے۔ لوتھر کا یہ وعظ مطبوعہ شکل میں موجود ہے۔ وہ لوگوں کو معلمی کا پیشہ اختیار کرنے پر ہمت دلاتا ہے اور کہتا ہے کہ جو معلم محنت سے لڑکوں کو تعلیم دیتا ہے اُس کی خدمت کا معاوضہ کوئی شخص پورے طور پر نہیں ادا کر سکتا۔ وہ خود کہتا ہے کہ "اگر میں واعظی کا پیشہ چھوڑنے پر مجبور کیا جاؤں تو میں معلمی کو اختیار کرونگا۔" معلم کو اس کا خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ دنیا اس کی کسقدر عزت کرتی ہے اور اُس کو کیا معاوضہ دیتی ہے بلکہ ہم کو اس پر غور کرنا چاہیئے کہ خدا کی نظر میں اس پیشے کا کیا درجہ ہے۔

---

عہ اس موقعہ پر یہ ظاہر کرنا دلچسپی سے خالی نہوگا کہ اس سے لوتھر کا جو مطلب ہے وہ قریب قریب اُس جواب کے ہم معنی ہے جو نظام الملک نے اس سوال پر دیا تھا کہ وہ کیوں بڑی بڑی کثیر رقمیں مدارس کے قیام پر صرف کرتا ہے۔ نظام الملک کا جواب تھا کہ "اے جان پدر! میں وہ فوج تیار کر رہا ہوں جسکے تیر آسمان کی ڈھال بھی نہیں روک سکتی" ۱۲

مضامینِ درس :-

(ا) لوتھر نے مذہبی تعلیم کو مقدم قرار دیا ہے۔ وہ پہلا ماہر تعلیم ہے جس نے مذہبی تعلیم کو اس اخلاقی تربیت سے بالکل جداگانہ مضمون قرار دیا ہے، جو مذہبی تعلیم سے حاصل ہوتی ہے۔ اور اس نے مذہبی تعلیم کو اخلاقی تربیت کے ایک جزو کے طور سے علیحدہ مستقل مضمون کی شکل میں تعلیم دینے کا مشورہ دیا ہے۔

(ب) لیکن ہم کو یہ دیکھ کر مایوسی ہوتی ہے کہ لوتھر نے لاطینی اور یونانی زبان کی سفارش کی ہے اور اپنی مادری زبان کو چھوڑ دیا۔ مگر اس بات کی تائید کا سہرا اس کے جانشین کامی نس Comenius کے سر رہا کہ کسی قوم کی عام تعلیم کے لئے اس قوم کی مادری زبان ذریعہ تعلیم ہونا چاہئے۔ احیائے علوم کا اثر لوتھر پر اس قدر زیادہ تھا کہ وہ پرانی روایات سے اپنے تئیں اس معاملہ میں بالاتر نہ کر سکا۔

(ج) علوم ریاضیہ اور علم الاشیاء کی تعلیم کی بھی لوتھر سفارش کرتا ہے۔

(د) علم تاریخ کا لوتھر خاص طور سے معترف تھا اور مورخین کو اس نے کہا ہے کہ وہ نہایت عمدہ معلم اور قابل قدر افراد ہوئے ہیں جو قدرت کے کاموں کو دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ایک موقع پر اس نے اس امر پر اظہار تاسف کیا ہے کہ میں نے علم تاریخ اور شعر و سخن کو اور زیادہ کیوں نہ حاصل کیا اور ان کی تعلیم کا مجھکو کیوں نہ موقعہ ملا۔

(ﮦ) لوتھر نے مختلف زبانوں کے سیکھنے پر زیادہ زور نہیں دیا کیونکہ اس کی رائے میں زبان محض ایک ذریعہ ہے کہ جس سے ہم اپنے خیالات کو ظاہر کر سکتے ہیں۔

(و) لوتھر کے نظام تعلیم میں جسمانی ورزش کو بھی فراموش نہیں کیا گیا۔

(ز) آخر میں لوتھر علم موسیقی کے حاصل کرنے پر بھی زور دیتا ہے اور اس کا قول ہے کہ

"جو معلم گانے سے ناآشنا ہوئیں اس کو کسی مصرف کا خیال نہیں کرتا۔ یہ رائے ہے اس واعظ و مبلغ مذہب عیسوی کی جو مناجات کو لحن کے ساتھ ادا کرنا ضروری اور مفید خیال کرتا ہے۔"

بچوں کے ساتھ نرمی اور آشتی کے ساتھ برتاؤ کرنے کی لوتھر نے تاکید کی ہے، اور کہا ہے کہ سیر و تفریح ان کے لئے اسی قدر ضروری ہیں جس قدر اکل و شرب۔ اور جو بچہ اپنے والدین کے سامنے خائف و لرزاں رہتا ہے وہ تمام عمر اتنا کمزور اور بودا رہے گا کہ پتہ کھڑکنے سے خوف زدہ ہو جائے گا۔

**جبریہ تعلیم** جبریہ تعلیم کے لئے کوئی سلطنت مندرجہ ذیل تین طریقوں کو اختیار کر سکتی ہے:-

(۱) وہ تعلیم کی اشاعت میں ممد و معاون ہو۔

(۲) تعلیم کی نگرانی اور اس کا انتظام و انصرام کرے۔

(۳) مخصوص فرقوں اور افراد پر اس کا نفاذ کرے۔

یہ امر اس کی مرضی پر منحصر ہے کہ ان میں سے کسی ایک یا زیادہ فرائض کو سلطنت خود رعایا کی سعی و کوشش کے حوالہ کر دے۔ سلطنت کی جانب سے تعلیم کو جبریہ کر دینے کے خیال کی ابتدا اس دور اصلاح سے ہوئی ہے جو لوتھر اور اس کے ہم خیال لوگوں نے شروع کیا تھا۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ تعلیم عام ہو اور سلطنت کی طرف سے اس کی امداد اور نگرانی کی جائے۔ سب سے پہلے سنہ ۱۶۱۹ء میں جرمنی کی ایک اسٹیٹ وائمار Weimar میں چھ سے بارہ برس کی عمر کے تمام بچوں پر اسکول کی حاضری لازمی و جبریہ قرار پائی اور اسی اصول کا اتباع جرمنی کی دوسری اسٹیٹس میں بھی کیا گیا۔ جبریہ حاضری کا قانون سب سے پہلے شاہ فریڈرک ولیم آف پروشیا نے سنہ ۱۷۱۷ء میں نافذ کیا۔ اس قانون میں یہ قرار دیا گیا کہ جس مقام پر مدارس کا وجود

ہے وہاں کے تمام والدین اس وقت سے اس بات پر مجبور ہونگے کہ اپنے بچوں کو مدارس میں بھیجیں ورنہ درصورت خلاف ورزی سخت سے سخت سزا کے مستوجب ہونگے۔"

اس کے بعد وقتاً فوقتاً قوانین کا سلسلہ نافذ ہوتا رہا جس کا مقصد و منشاء ابتدائی تعلیم کی حالت کو ترقی دینے کا تھا۔ اگرچہ تعلیم جبریہ تھی لیکن ۱۸۸۸ء یعنی ڈھائی صدی سے زیادہ مدت تک مفت نہیں ہوئی۔

**فرانس** لوتھر کے زمانے سے پیشتر فرانس میں ۱۵۶۱ء میں آرلینیس Orleans کے اسٹیٹ جنرل نے بادشاہ کی خدمت میں حسب ذیل عرضداشت پیش کی:-

"حضور عالی یہ حکم نافذ فرمائیں کہ کلیسا کی آمدنی میں سے معقول رقم ہر شہر کے اساتذہ اور علما کی مدد کے لیے اس غرض سے دی جائے تاکہ ملک کے خواہشمند نوجوان کی تعلیم و تعلم کا کام انجام پذیر ہو سکے۔ اور تمام والدین پر لازم کیا جائے کہ وہ اپنے بچوں کو درسگاہوں میں بھیجیں اور درصورت خلاف ورزی سزائے جرمانہ کے مستوجب ہوں اور اس قانون کا نفاذ لارڈوں اور معمولی مجسٹریٹوں کے ذریعے سے ہو۔"

جبریہ تعلیم کے مسئلہ نے فرانس میں ایک تعلیمی مسئلہ کی شکل اختیار کی اور ٹیلی رانڈ Talleyrand جیسے مضمون نگاروں نے اس بنا پر اس کی مخالفت کی کہ اس سے انسانی آزادی سلب ہوتی ہے اور سترہویں و اٹھارہویں صدی کے امرا محض اس بنیاد پر اس کے مخالف تھے جیسا کہ ڈیڈرو Diderot نے سچائی و راست گوئی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ "جو کسان لکھنا پڑھنا جانتا ہے اُس پر دست تظلم دراز کرنا بہ نسبت جاہل کاشتکار کے دشوار ہے۔"

لوئی بولوں نے فرانس میں اسکول کی حاضری تین برس کی عمر میں جبریہ قرار دی تھی۔ مگر نپولین نے پھر جبریہ تعلیم کے اصول کو تسلیم نہیں کیا۔ ۱۸۷۱ء میں سیمن

سے کے مسودہ قانون میں اس اصول کو دوبارہ تسلیم کیا گیا مگر یہ قانون پورے طور سے سنہ ۱۸۸۲ء تک نافذ نہو سکا اور اس وقت یہ قرار پایا کہ جبریہ تعلیم ۱۱ سال کی عمر تک لازمی ہو جبکہ طالب علم پبلک امتحان پاس کرے اور اس میں مذہبی تعلیم اختیاری قرار دی گئی۔

جرمنی میں مذہبی تعلیم بھی لازمی ہے اور طلبہ کو بجائے ۱۱ برس کے ۱۳ و ۱۴ سال تک اسکول میں رہنا پڑتا ہے۔

**انگلستان** سنہ ۱۸۷۰ء تک جبریہ تعلیم کی بابتہ مندرجہ ذیل دو خاص اسباب سے کوئی کوشش نہیں کی گئی:-

(۱) تعلیم کا کام انگلستان میں رعایا کی ہمدردی اور فیاض جماعتوں کے ذریعہ سے ہوتا تھا اور سلطنت مدرسوں میں طلباء کی حاضری کو جبری کرنے سے معذور تھی۔

(۲) انگریزی قوم کا خاصہ طبیعت انفرادیت کا غلبہ رکھتا ہے۔

سنہ ۱۸۶۴ء میں ایک وزیر صاحب نے فرمایا کہ "میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اگر ایسا قانون منظور کیا گیا اور نافذ ہوا جس سے وہ والدین جو اپنے بچوں کو مدارس میں نہیں بھیجتے سزائے قیدخانے کے مستوجب قرار دیے جائیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کل قوم میں بلوہ ہو جائے گا"

سنہ ۱۸۷۰ء میں بورڈ اسکول قائم ہوئے اور جبریہ تعلیم کے اصول کا ایک حد تک عملاً نفاذ کیا گیا۔

سنہ ۱۸۷۶ء میں ایک قانون پاس ہوا کہ پانچ سے چودہ برس تک کے بچوں کے والدین کو کسی مستند مدرسہ میں داخل کرنا لازمی ہوگا۔ اور اگر والدین کسی غیر مستند مدرسہ میں داخل کرائیں گے تو مدرسہ کی عمدگی کا ثبوت دینا والدین کے ذمہ ہوگا۔

**ریاست ہائے متحدہ امریکہ** یہ سلطنت زیادہ تعداد میں چھوٹی چھوٹی ریاستوں

کا مجموعہ ہے جن میں سے ہر ریاست نظام تعلیم کے اعتبار سے بالکل آزاد اور خود مختار حیثیت رکھتی ہے۔ جبریہ تعلیم کے بارہ میں جو مشکلات اور موانعات سلطنت ہائے متحدہ امریکہ میں پیش آئیں اور جس طرح اُن پر غلبہ حاصل کیا گیا اُن سے بہ نسبت اُن ممالک کے جہاں ایک ہی قسم کے رسم و رواج اور ایک ہی قسم کے قومی شعار موجود ہیں نہایت کار آمد نتائج کا استخراج ہوتا ہے۔

میں اس موقعہ پر صرف چند دقتوں کے تذکرہ پر اکتفا کرتا ہوں اور مختلف ریاستوں کی تاریخ یا تفصیلی حالات کے متعلق اس مضمون کی کسی خاص تصنیف کے مطالعہ کی سفارش کرتا ہوں :-

(الف) قابل اساتذہ کی کمیابی۔

(ب) عمارت اور جگہ کی قلت۔

(ج) فنڈ کی کمی۔

(د) مقامی لوگوں کی بے پرواہی۔ چند خاص تعلیم یافتہ لوگوں کی تقریروں یا چند سربرآوردہ اخبارات کے مضامین کو اس مقام پر عام رائے نہیں کہا جا سکتا۔

(ہ) جبریہ تعلیم کے قانون کو نفاذ دینے میں اس مقام کے حکام سرکاری یا لوکل پولیس کی بے توجہی۔

(و) قومی جذبات

(ز) مذہبی جذبات

(ح) والدین کا افلاس و ناداری۔

(ط) اس بات کے معلوم کرنے کے لئے کہ شروع سال میں بچوں کی کتنی تعداد اسکول کے لئے موجود ہو گی۔ بچوں کی تعداد و عمر کے اندراجات کا انتظام باقاعدہ نہ ہونا۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ وہ چند مشکلات ہیں جن کا کہ امریکہ کی ریاستوں کو مقابلہ کرنا پڑا۔ مگر ان میں سے کوئی دقت ایسی نہیں جس کا انسداد ممکن نہ ہو مگر یہ ضروری ہے کہ اس کو ایک آسان مسئلہ نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ اس کی مشکلات کو پورے طور پر سمجھ کر ان پر حاوی ہونے کی کوشش کرنا چاہیئے۔

## اسٹورم Sturm

جہاں تک کہ تدریس کا عملاً تعلق ہے اسٹورم کو نمایاں درجہ حاصل ہے۔ وہ ۱۵۰۷ء میں کولون Cologne کے قرب وجوار میں پیدا ہوا تھا اور اولاً لیج Liege اور اس کے بعد پارس میں اس نے تعلیم پائی۔ اس کا ارادہ فن طب کی تکمیل کر کے ڈاکٹری پیشہ اختیار کرنے کا تھا لیکن ادبیات کے ذوق وشوق نے اس کو اس سے کنارہ کشی پر مجبور کیا اور اس نے کلاسیکل لٹریچر (السنہ قدیمہ) پر لکچر دینے کی خدمت اختیار کرلی۔ وہ اسٹراس برگ Strasburg گیا اور وہاں جاکر اس نے سب سے پہلا جمنازیم قائم کیا جس کے نمونے پر جرمنی میں اس قسم کے دوسرے انسٹیٹیوشن قائم ہوئے۔

اسٹورم نہایت عمدہ صفات کا شخص تھا۔ قوت ارادی کے ساتھ اس میں فراست اور اثر ڈال کر کام کرنے کا نہایت اچھا مادہ تھا۔ کسی کام کو بخوش اسلوبی جاری کرنیکی خاص قابلیت اور تقریر کی فصاحت وبلاغت اور طرز ادا کی وجہ سے وہ نہایت با اثر شخص تھا۔

اس نے جمنازیم Gymnasum کے قواعد وضوابط شائع کئے جس کا عنوان تھا

عہ ملک جرمنی کے ہائی اسکول جن میں السنہ قدیمہ کا درس خصوصیت کے ساتھ دیا جاتا ہے۔ ابتداً ملک یونان کی درسگاہیں اس نام سے موسوم تھیں۔

"مدارس جاری کرنے کا صحیح طریقہ" ان قواعد وضوابط کے دیباچہ میں اسٹرم نے سب سے پہلے علم وحصول علم کی قدر وقیمت پر اساتذہ کی اہمیت اور ان کے مشاہرات مدارس سے والدین کے تعلقات اور غیر مستطیع بچوں کے لئے سہولتیں اور آسانیاں بہم پہنچانے کے متعلق بحث کی ہے۔

اسٹرم نے اس امر کی سفارش کی ہے کہ مختلف جماعتوں میں بچوں کو منقسم کیا جائے اور ہر جماعت کے لئے خاص نصاب تعلیم اور اس کے لئے مقررہ مدت تعلیم معین کی جائے۔ اور اس طرح وہ موجودہ جماعت بندی کے طریقۂ تعلیم کا عملاً موجد ہے اس سے پہلے تعلیم شخصی ہوتی تھی اور دفعہ بندی اسٹورم کے زمانہ سے شروع ہوئی ہے۔ اسٹرم کا نصاب تعلیم اور اسٹرم کی کتب درسیہ کو انگریزی پبلک اسکولوں اور دوسرے ممالک کے اسکولوں میں اختیار کر لیا گیا۔ کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ پچاس سال قبل تک تمام بڑے بڑے پبلک اسکولوں میں یعنی ایٹن، ونچسٹر، ولیسٹ منسٹر وغیرہ وغیرہ میں نصاب تعلیم زیادہ تر اسٹرم کے طریقہ پر مروج تھا۔ اسٹرم کے طریقے کا اثر ممالک یورپ میں تھا وہ تقریباً اس ہمہ گیر اثر کے مطابق ہے جو درس نظامیہ کے طریقۂ نصاب کو ممالک اسلامی میں حاصل رہا ہے اور ایک حد تک اب بھی ہندوستان کے مسلمانوں میں اس درس کو حاصل ہے۔

اس طرح کے نصاب میں جو نقائص ہیں وہ یہ ہیں کہ لاطینی و یونانی زبانوں کی تحصیل پر تو اس نے بہت زور دیا ہے اور مادری زبان و ریاضیات اور علوم طبیعیات کے تحصیل کی طرف سے غفلت برتی ہے۔

اسٹرم کے نصاب تعلیم کی مدت ۱۴ سال کی ہے اور موجودہ زمانہ کے نصاب تعلیم کے مطابق ہے۔ ان ہی قواعد وضوابط میں اسٹورم نے ہر ایک جماعت کی خواندگی سال بسال کی اسی طریقہ سے لکھی اور ان کو ایسا ہی تقسیم کیا ہے جیسی کہ ہم اس

زمانہ میں اسکولوں کی پراسپکٹس میں پاتے ہیں۔

زمان زیر بحث میں جو اٹھارہویں صدی عیسوی کے شروع تک ختم ہوتا ہے تین خاص رجحانات تعلیم کے متعلق نمایاں طور سے معلوم ہوتے ہیں :-

(۱) مذہبی (۲) ذہنی (۳) عملی

رجحان ذہنی احیائے علوم کا نتیجہ تھا اور عملی رجحان اس سخت گیر تعلیم کا جو دینیات اور علوم عقلیہ کی آمیزش سے پیدا ہوتی تھی۔ دینیات کو ترقی دے کر سائنس کا درجہ عطا کیا گیا اور منطقی دلائل کے ساتھ معتقدات مذہبی کو ترقی دی گئی تھی اور نہایت ادنیٰ ادنیٰ مسائل کی چھان بین میں ذہانت اور طباعی کے جوہر دکھاتے جاتے تھے علمائے مذہب نہایت متعصب اور تنگ نظر ہو گئے تھے۔

اس دور میں استادوں کا درجہ بہت مبتذل تھا جس کا اندازہ ڈیٹ کے مندرجہ ذیل فقرہ سے ہوگا۔

"...... اساتذہ کا زیادہ حصہ ایسے لوگوں پر مشتمل تھا جو بوجہ جسمانی یا دماغی نااہلیت کے اپنی زندگی میں نامراد و ناکام رہے ہوں اور جنہوں نے فن معلمی کو بطور آخری سہارے کے اختیار کیا ہو۔ ان کا مشاہرہ کچھ انڈے اور مکھن تک محدود تھا اور بسر اوقات کے لئے ان کو دوسرے مشاغل اختیار کرنا پڑتے تھے۔ ناچ کی مجالس میں ستار بجاتے شراب خانے جاری کرتے یا کسی نہ کسی طریقے سے کوئی تجارتی کام کرتے تھے"

ان حالات کو پڑھکر کیا ہمارے ذہن میں اپنے یہاں کے ملاں جی یا نابینا حافظ جی کی ناگفتہ بہ حالت اور ان کی کمزوریوں کا تصور نہیں بندھتا؟ اور اب بھی باوجود یورپین شائستگی اور یورپین اثر پھیلنے کے ہم استادوں کے درجے کو بالاتر نہیں کر سکتے۔ قابل خدمتگار کو ۲۰ ماہوار دینے پر بخوشی تیار ہیں، جاہل باورچیوں

بیس بیس روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی ہے مگر معلمین کی تنخواہ اب تک چھ روپیہ ماہوار چلی جا رہی ہے

## جیزوئسٹس[1] Jesuits

جیزوئسٹس سے زیادہ کسی قوم یا جماعت انسانی نے اشاعت تعلیم کے متعلق خدمات انجام نہیں دیں۔ دشمنوں نے اس فرقہ پر نہایت شدت سے نکتہ چینی کی ہے، اور دوستوں نے تعریف و توصیف میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ والٹائر riatlov کا قول ہے کہ جیزوئسٹ لوگ جو تعلیم دیتے ہیں اس میں لاطینی زبان کے سوائے سب مزخرفات ہے۔ اور کمپیارے Oompayre نے ان لوگوں کو ترقی و اصلاح کا دشمن قرار دیا ہے اور میکالے Macaulay کی رائے میں اس فرقہ نے دماغی و ذہنی تربیت کو بڑی حد تک حاصل کیا تھا لیکن باوجود ذہانت اور طباعی کے عقل اور دماغ کو کورانہ تقلید کی جکڑبندیوں سے آزاد نہ کر سکے۔ برخلاف اس کے بیکن کہتا ہے کہ "جیزوئسٹس کے مدارس کو ایک نمونہ قرار دو کیونکہ ان سے بہتر مدارس کا وجود نہیں ہے۔ جب میں اس بات پر نظر کرتا ہوں کہ اشاعت تعلیم اور دل و دماغ کی نشو و نما میں جیزوئسٹس جس مستعدی اور تدبیر سے کام کرتے ہیں تو مجھ کو اس مشہور ضرب المثل کی یاد تازہ ہوتی ہے کہ "چونکہ تم نہایت ہی شریف الخیال ہو حسرت ہے کہ کاش ہم میں سے ہوتے"۔

ان لوگوں کی موافقت یا مخالفت میں خواہ کچھ بھی کہا جائے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پوری ایک صدی تک دنیائے عیسویت کے تمام مشاہیر و اکابر نے اسی فرقہ کے مدارس میں تعلیم و تربیت حاصل کی اور تعلیم کے متعلق یہ فوقیت اور برتری اس فرقہ کو اٹھارویں صدی کے آخر تک حاصل رہی۔

---

[1] جیزوئسٹس رومن کیتھلک فرقہ سے تعلق رکھتے تھے اور اسی مذہب کی روایات کے مطابق تعلیم دیتے تھے۔ اور ایک موقع پر بیکن نے یہ خواہش کی ہے کہ کاش وہ پروٹسٹ ہوتے۔

چونکہ ہمارے اور اس فرقہ کے زمانِ عمل میں تقریباً تین صدی تک کی مدت حائل ہے
ہم بغیر کسی جنبہ داری کے اور بلا اس کے کہ ان کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کو نظر انداز کریں
ان خدمات پر نظر تنقید ڈال سکتے ہیں جو اس فرقہ نے تعلیم کے متعلق انجام دی ہیں۔
جزوئٹس نے اگرچہ اصول تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، لیکن عملی حیثیت سے
انہوں نے نمایاں کامیابی حاصل کی اور تعلیم دینے کے بعض طریقے انکی خاص ایجاد ہیں
اور جن پر کاربند ہونا فائدہ سے خالی نہیں۔
اس جماعت کو اسپین کے ایک امیر نامی Ignatius نے
قائم کیا تھا جس کی ولادت ۱۴۹۴ء میں بمقام Loyola واقع ہوئی تھی۔
۱۵۲۳ء Ignatius نے ارض مقدس کا سفر اس ارادہ سے اختیار کیا کہ مسلمانوں
میں دین عیسوی کی تبلیغ کرے۔ ۱۵۳۹ء میں اس نے یہ مذہبی جماعت قائم کی جس کو
پوپ پال سوم نے دوسرے سال مہر قبولیت عطا کی۔ اس جماعت کے قائم کرنے کا
مقصد فرقہ کیتھلک کے عقائد کی تبلیغ و اشاعت کرنا اور اس کو قوی الاثر بنانا تھا اور اسی
وجہ سے فرقہ پروٹسٹنٹ سے انکو دست و گریبان ہونا پڑا۔

**نظام تعلیم** اس فرقہ کے نظام تعلیم کا بیان ایک کتاب میں کیا گیا ہے جس کا نام
Ratio Studiorum ہے یعنی فرقہ جیسوئٹ
کے طریقہ تدریس و طرز تعلیم" اس کو چھ اشخاص نے باہم مل کر تیار کیا تھا اور بعد کامل نظرثانی
کے ۱۵۹۹ء میں طبع کی گئی۔ یہ تصنیف نہایت قیمتی سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہے، کیونکہ
اس وقت کے تمام نظام تعلیم پر جس میں اسٹروم کا سلسلہ درس بھی شامل ہے کامل غور و
بحث کے بعد اس کتاب کو ترتیب دیا گیا ہے۔
جزوئٹس کا نظام تعلیم ہندوستان کے موجودہ سرکاری نظام تعلیم کے مطابق تھا۔
اس فرقہ کا جنرل تعلیمی محکمہ کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا جس کا صدر مقام روم تھا۔ جنرل کے بعد

تھے جن کو جنرل مقرر کرتا تھا۔ ہر کالج کا افسر اعلیٰ ریکٹر Rector Provincial
کہلاتا جس کا تقرر تین سال کے لئے جنرل کرتا تھا۔ ریکٹر، پراونشل کے ماتحت تھے اور
اپنی رپورٹیں پراونشل کو بھیجتے تھے۔ اس کے بعد "افسران تعلیم" کا درجہ تھا جو
Prefect کے نام سے موسوم تھے اور جن کا تقرر ریکٹر کے اختیار میں نہیں
ہوتا تھا، بلکہ اُن کو پراونشل مقرر کرتا تھا۔

اُستادوں کی نگرانی کا کام بھی ریکٹر اور پریفکٹ کے سپرد تھا اور پریفکٹ کا یہ
فرض تھا کہ کم از کم مہینے میں دو مرتبہ ہر استاد کو درجہ میں پڑھاتے ہوئے سُنے۔ ہر
تعلیم گاہ میں ایک منتظم کی جگہ ہوتی تھی، جسے پروکٹر Proctor کہتے تھے۔ اس کا
فرض یہ تھا کہ استادوں کے حکم کے مطابق جسمانی سزا کا انتظام رکھے۔ استاد کو امداد دینے
کے لئے ہر کلاس میں مانیٹر Monitor منتخب کئے جاتے تھے۔ لڑکوں کی سالانہ
کلاس کی تبدیلی کے ساتھ اُستادوں کی تبدیلی بھی ہوتی تھی۔ اُستاد سال بسال ایک ہی
جماعت کو نہیں پڑھاتے تھے، بلکہ ایک ہی شاگرد کو پڑھایا کرتے اور طلبہ کی ترقی کے ساتھ
اُستاد بھی اوپر کی جماعتوں کو پڑھانا شروع کردیتے تھے۔ اُستاد طالب علموں کے
ساتھ ساتھ رہتے تھے اور وہ اُن کی ترقی کے پورے ذمہ دار تھے۔ اس کا خیال رکھا
جاتا تھا کہ ایک ہی جماعت کو کم از کم ایک گھنٹہ روزانہ مقررہ کلاس ماسٹر تعلیم دے
یہ طریقہ اب بھی اسکاٹلینڈ Scotland میں عام طور پر رائج ہے اور اس طریقہ
کی حمایت میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔

امتحانات ایک کمیشن کی نگرانی میں ........ لئے جاتے تھے اور اس کمیشن کا
پریفکٹ اکس آفیشو (بلحاظ عہدہ) ممبر ہوتا تھا۔ اساتذہ اگرچہ امتحان کے وقت موجود رہتے
تھے مگر وہ ممتحن نہیں ہوتے تھے۔ امتحان کے نتائج کے وقت طالب علموں کے سال
بھر کے ریکارڈ پر کافی غور کیا جاتا تھا۔ اور اُمیدواران کے نام قابلیت کے لحاظ سے

ترتیب وار چھاپ دیے جاتے تھے۔

پڑھائی کو خوشگوار بنانے کی بڑی کوشش کی جاتی تھی، اور استادوں کو اپنے شاگردوں کی قابلیت اور رجحان کا معلوم کرنا ضروری ہوتا تھا اور ان سے کبھی بہت زیادہ کام نہیں لیا جاتا تھا۔ اور اس مثل کے مطابق کہ جب لڑکے استاد کو پسند کرینگے تو تعلیم کو بھی پسند کرینگے۔ ہر استاد سے امید کی جاتی تھی کہ وہ لڑکوں کی پسندیدگی حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ استادوں کو چاہئے کہ وہ طالب علم کی تعلیم ہی میں دلچسپی نہ لیں بلکہ طالبعلم کے کام میں بھی دلچسپی لیں۔ استاد ان لڑکوں کی خوشی سے خوش ہوں اور ...... رنج سے رنجیدہ ہوں۔

ایک خصوصیت جسوئٹ طریقۂ تعلیم کی یہ تھی کہ وہ آگے بڑھنے کی ترغیب دینے کی کوشش کرتے تھے۔ Ratio Studorium کے مطابق یہ نہایت ضروری ہے کہ شریفانہ طور پر آگے بڑھنے کی ترغیب دینے سے تعلیمی ترقی میں بڑی مدد ملتی ہے۔ جزوٹس کے یہاں نہایت شاندار طریقے سے تقسیم انعام کا جلسہ سالانہ ہوتا تھا جس میں اُنھوں نے تمغہ جات اور خطابات کے تقسیم کے طریقے کو رواج دیا۔ کلاس میں دو دو طلبہ کے جٹ بنا دئے جاتے، اور ہر ایک جٹ کا دوسری جٹ سے باہمی مقابلہ ہوتا تھا۔ ان جٹوں کے علاوہ ہر ایک جماعت دو مخالف کمپنیوں میں تقسیم ہو جاتا تھا ایک کو روم Rome اور دوسرے کو کارتھیج Carthage کہتے تھے اور ان کمپنیوں کے مقابلے مقررہ مضامین کے متعلق سوالات پر ہوتے تھے لیکن جزوٹس Jesuits نے اس باہمی مقابلے پر ضرورت سے زیادہ اس درجہ زور دیا کہ طلبہ کے برادرانہ تعلقات میں فرق آنے لگا۔

ان کے یہاں طالب علموں کی پولیس کا طریقہ بھی تھا۔ جزوٹس کے اصول میں سے ایک اصول یہ تھا کہ ہر چیز کی بنیاد نہایت مستحکم ہونی چاہئے۔ جس کی آگے چل کر پسٹالازی

نے بھی نہایت شدومد کے ساتھ تائید کی ہے اور ان پر عمل پیرا ہونا نوخیز نسلوں
کے لئے نہایت مفید بنایا ہے جن پر کسی قوم کی ترقی و تنزل اور اس کے عدم
و وجود کا تمام تر دار و مدار ہے۔ کیونکہ مستحکم اور صرف مستحکم بنیادوں پر مضبوط اور پائدار اور
عالی شان عمارت تعمیر کی جاسکتی اور قایم رکھی جاسکتی ہے۔ اسی پر اقوام و ملل کے نظام
کو قیاس کرنا چاہئیے جس کے حصار مشید کے بقا کا انحصار محض نوخیز نسلوں پر ہی جو بمنزلہ اسکے بنیاد کی ہوتی ہیں
وہ سبقوں کے بار بار دہرائے جانے کے تکلیف دہ طریقہ پر عمل کرتے تھے۔ جسوئٹ مدارس
میں تعلیم مفت ہوتی تھی اور اگر فیس دینے کی گنجایش نہ ہوتی تو وہ کھانے اور مکان
کا بھی کچھ نہیں لیتے تھے۔ ان کے مدارس میں امرا کے ساتھ کسی قسم کی رعایت نہیں تھی
(Ratio Studiorum) میں صاف طور پر کہا گیا ہی کہ غریبی اور افلاس طالب علم
کے داخلے کے واسطے کوئی رکاوٹ نہیں ہیں۔ مدرسے عطیوں اور اوقاف سے چلتے تھے۔ اگر
انھیں روپیہ کی قلت محسوس ہوتی تھی تو دربدر مانگ کر پوری کی جاتی تھی۔ جسوئٹ طریقہ تعلیم میں
ابتدائی تعلیم کا کوئی حصہ نہیں تھا۔ ملکی زبان کی طرف سے اس قدر بے پرواہی کی جاتی تھی کہ طالب
علموں کو سوائے اتوار کے اور کسی روز اس میں گفتگو کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ نیچرل
سائنس اور تواریخ کو غیر ضروری سمجھا جاتا تھا۔ ایک جسوئٹ معلم کا قول ہے کہ تاریخ کا مطالعہ پڑھنے
والے کو ہلاک کرتا ہے۔ یہ لوگ محض لفظی تعلیم کی طرف مصروف رہے اور اپنی تمام کوششیں اس پر
صرف کرتے تھے کہ لاطینی اور یونانی زبان میں فصیح و بلیغ عبارت لکھ سکیں۔

جسوئٹ کے اس وقت ہندوستان میں تین بڑے نامی کالج موجود ہیں سینٹ زیویر
کلکتہ، ترچناپلی اور بمبئی میں۔ ان کے پرنسپل کو رکٹر (Rector) کہتے ہیں
جو اب بجائے تین سال کے چھ سال کے لئے مقرر ہونے لگا ہے پرنسپل کے عہدہ
کا چارج لینے کے بعد یہ بھی ممکن ہے کہ اُن کو پرائمری اسکول میں چھوٹی جماعت پڑھانے کے لئے
دیدی جائے۔ یہ تینوں کالج اور مدارس سپیریر (Superior) کے ماتحت ہیں ہندوستان
میں تین ہیں اور اُن کا قیام کلکتہ، مدراس و بمبئی میں ہے۔

شمالی ہندوستان میں ان کی کوئی درسگاہ موجود نہیں ہے۔ کلکتہ میں ان کا مدرسہ بہترین سمجھا جاتا ہی اور بنگالہ کے تمام سربرآوردہ مسلمان کلکتہ والی درسگاہ کے پُرانے طالب علم ہیں۔ ان کا جنرل آج کل سوئٹزرلینڈ میں رہتا ہے۔

## کومی نس COMENIUS.

کومی نس کو عہد جدید کے اصول تعلیم کا بانی کہتے ہیں مشلے (Michelet) اس کا ذکر بڑی تعظیم کے ساتھ کرتا ہے اور کہتا ہی کہ کومی نس عہد جدید کی تعلیمات کا پہلا پیغمبر ہے اور پسٹالوزی دوسرا۔ بیکن نے سترھویں صدی کے شروع میں علمی تحقیقات کی نئی نئی راہیں کھول دیں مگر کومی نس نے بیکن کے قایم کردہ طریقوں پر اصول تعلیمات کو منطبق کیا۔ بیکن اور کومی نس دونوں نے لفظ کو چھوڑ کر اُس کی جگہ حقایق کے مطالعہ اور عالم کے مشاہدہ کو دی اور ارسطو کی منطق استدلالی کے تجربات و مشاہدات کو رائج کیا۔

کومی نس ۱۵۹۲ء میں موراویا (Moravia) میں پیدا ہوا۔ اس کے سرپرستوں نے اسے فرقہ بوہمیہ کے عقائد سکھائے (کومی نس کے والدین اُس کے بچپن ہی میں انتقال کرگئے تھے) ابتدائی تعلیم موراویا کے اسکولوں میں پائی اور سولہ برس کی عمر میں پریراؤ کے جمنازیم میں لاطینی زبان شروع کی۔ اس نے دیکھا کہ جو خرابیاں طالب علم کی غفلت اور بے پرواہی کے سر تھوپی جاتی تھیں وہ حقیقت میں اُستادوں کی ناقابلیت کا نتیجہ تھیں کیونکہ وہ ٹھیک طریقہ پر پڑھا نہیں سکتے۔

۱۶۱۲ء میں یعنی جب اُس کی عمر بیس برس کی ہوئی تو کومی نس یونیورسٹی میں داخل ہوا اور جرمن طریقہ کے مطابق امسٹرڈام اور ہائی ڈل برگ (Heidelberg) کی یونیورسٹیوں میں

جرمن طریقہ تعلیم | جرمنی میں قاعدہ یہ ہے کہ ہر ایک طالب علم اپنی یونیورسٹی چھوڑ کر تبدیلی خیالات اور وسعت معلومات حاصل کرنے کے لئے دو ایک اور یونیورسٹیوں میں بھی جاتا ہی اور تجربہ کے بعد ان میں سے ایک کو پسند کرکے ڈگری حاصل کرتا ہی۔

تعلیم جاری رکھی۔

**ادارہ علمی کی سکیم** کومی نس کی ساری عمر تکلیف اور مصیبت میں کٹی لیکن وہ ہمیشہ بڑے ثبات واستقلال کے ساتھ مصائب کا مقابلہ کرتا رہا۔ جس طرح بیکن نے تجویز کیا تھا کہ بڑا انسٹی ٹیوشن موسوم ادارہ سلیمان قایم ہو، کومی نس نے بھی ایک عظیم الشان ادارہ علمی کی اسکیم بنائی جہاں پر تمام دنیا کے عالم تحقیقات میں مصروف ہوں اور اس ادارہ کا خرچ تمام دنیا کی قومیں مل کر برداشت کریں۔ انگلستان کی پارلیمنٹ نے کومی نس سے انگلستان آنے کی خواہش کی کہ چلسی کالج لندن میں اپنی اسکیم کو چلائے۔ لیکن ۱۶۴۱ء میں آئرلینڈ میں فساد ہوگیا اور کومی نس کو مجبور ہو کر انگلستان سے چلا آنا پڑا۔ اس کے بعد وہ سویڈن گیا۔ وہاں متمول اور صاحب فراست باشندہ وبینارک نامی نے اس اسکیم میں اُس کی دستگیری کی۔ لیکن کومی نس کو کبھی آسایش نصیب نہ ہوئی اور وہ ہمیشہ تنگدستی میں مبتلا رہا۔ ان ایام میں وہ اپنے دوست ہارٹلیب کو لکھتا ہے کہ "میں افکار اور پریشانیوں میں دبا ہوا ہوں اور دست سوال پھیلاتے پھیلاتے بیزار ہوگیا ہوں"۔ آخر کومی نس نے اپنے وطن کو معاودت کی۔ لیکن وہاں پہنچ کر بھی چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے ہم عقیدہ لوگوں پر اُسی طرح ظلم وستم ہو رہا ہے انجام کار وہ پھر ترک وطن پر مجبور ہوگیا اور اُس کے مرحوم مربی De Geer ڈگیر کے بیٹے نے آخرکار اُسے پناہ دی اور بالآخر نے ۱۶۷۱ء میں اسی برس کی عمر میں اس جہان فانی سے اس نے رحلت کی۔

**کومی نس کی تصانیف** کومی نس نے مختلف موضوعوں پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ مگر وہ کتابیں جن کی بدولت کومی نس کو دنیا کے سب سے بڑی معلمین کی صف اولیں میں جگہ ملی وہ یہ ہیں

(۱) یعنی اصول درسیات وتعلیمات Didactica Manga اس معرکۃ الآرا کتاب میں کومی نس نے تعلیم کے نظریات اور اصول نیز مدرسوں کے علمی نظم ونسق پر بحث کی ہے۔

(۲) فتح باب الالسنہ The Janua linguarum reserata اس میں زبان سیکھنے کے

طریقے بتائے ہیں۔ کومی نس نے اس کتاب میں وہ خاص طریقے بھی درج کئے ہیں جن سے
وہ لاطینی سکھاتا تھا۔ لیکن اب کومی نس کے طریقوں سے بہتر طریقے معلوم ہو چکے ہیں۔

(۳) عالم محسوسات بالتصویر The Orbis sensualium pictus یہ پہلی بالتصویر
ریڈر ہے جس میں ہر سبق کے ساتھ بچوں کی دلچسپی اور ان میں غور کا مادّہ پیدا کرنے کے
لئے تصویریں بھی درج ہیں۔ اور جتنی بالتصویر ریڈریں آج تک لکھی گئی ہیں جن کا شمار امکان
سے باہر ہے وہ سب اسی کتاب کے نمونہ پر لکھی گئی ہیں۔ کومی نس کے اس نئے طرز کی
ایجاد کی پیروی دنیا میں بہت تیزی کے ساتھ ہوئی ہے۔ اور اب تو یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا
کہ تصویردار کتب درسیہ نے ہمارے اوپر ایسا زبردست حملہ کیا ہے کہ ہم اُن کے بے شمار
تعداد کے مقابلہ میں عاجز آگئے ہیں۔

**پڑھانے میں سخت گیری کی ممانعت**

کومی نس کہتا ہے کہ تعلیم و تعلم میں ہرگز سختی و سخت گیری نہیں
ہونی چاہیئے۔ بچّے علم اس طرح سیکھ لیں جس طرح مچھلیاں تیرنا
پرندے اُڑنا، اور چوپائے چلنا سیکھ لیتے ہیں۔ فطرت کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ ٹھیک وقت پر
کام کرتی ہے پس ہمیں بھی اُس وقت تک پڑھنا شروع کرانا نہیں چاہیئے جب تک بچّہ کا
دماغ اُس کے قبول کرنے کے قابل نہ ہوجائے۔ پس کومی نس کا ایک اصول یہ ہے کہ بچّے
وہی بات سیکھیں گے جس کے سیکھنے کی خواہش ان کے دل میں موجود ہو۔ وہ کہتا ہے کہ تعلیم
میں یہ ترتیب رکھنی چاہیئے: پہلے قوائے حاسّہ کی تربیت اس کے بعد قوّت حافظہ کی اس کے
بعد قوت مدرکہ، ذہن یا عقل کی تربیت اور سب کے بعد قوت تمیز و تنقید کی۔

**جیسوئٹس طریقہ و اصول تعلیم**

Jesuits کی طرح وہ بھی اسکول کے گھنٹے چھوٹے چھوٹے
رکھنے کا مشورہ دیتا ہے اور زیادہ تر کام جوش منافست، مدح
اور ذم سے لینا چاہتا ہے۔ مگر جس طرح جیسوئٹس (Jesuits) علم کا شوق پیدا کرنے
کے لئے فقط جوش منافست پر تکیہ کرتے ہیں، کومی نس اس کا قائل نہیں۔ بلکہ اس کے

پیدا کرنے کے لئے وہ ہر قسم کے ذرائع کو استعمال کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ والدین اور اُستادوں کی ترغیب، اسکول کی عمارت اور سامان، خود مضامین تعلیم کی دلکشی، طریقۂ تعلیم کی دلچسپی، سلطنت کی تائید سب سے کام لینے کی فہمائش کرتا ہے۔ کومی نس کہتا ہے کہ

(۱) والدین کو چاہیئے کہ بچے کے سامنے علم اور اہل علم کی تعریف کیا کریں۔ انھیں اچھی اچھی خوبصورت کتابیں دکھایا کریں اور خود بھی اُستادوں کی بہت زیادہ تعظیم و تکریم کیا کریں۔

(۲) اُستادوں کو چاہیئے کہ بچوں سے پدرانہ شفقت اور محبت کے ساتھ پیش آئیں اور انعام و اکرام اور تعریف و توصیف سے موقعہ بموقعہ اُن کے دل بڑھائیں۔ اور جب ممکن ہو بچوں کو اچھی اچھی چیزیں دکھائیں۔

(۳) مدرسے کی عمارتیں سُبک، ہوادار اور فرحت بخش ہوں۔ اُن کا ساز و سامان اچھا ہو۔ مثلاً تصویریں، نقشے، مختلف اشیا کے نمونے اور اُن کے مجموعے۔

(۴) سلطنت کی تائید متفرق طریقہ سے ہو سکتی ہے، مثلاً سلطنت کے اکابر اسکولوں میں اچھے طلبہ کو انعام خود اپنے ہاتھ سے دیں، اُن کے اوپر مراعات کا اظہار کریں تاکہ اور لوگوں کو بھی ویسا بننے کی خواہش ہو۔

آج جو مرتبہ درس و تدریس میں مطالعہ فطرت کو دیا جاتا ہے وہ سب کومی نس کی بدولت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جہاں تک ہو سکے ہمیں کتابوں سے نہیں بلکہ صحیفہ فطرت کے مطالعہ (زمین آسمان، شجر و حجر) سے علم حاصل کرنا چاہیئے۔

کومی نس سزائے جسمانی کا قائل نہیں۔ سزا فقط اخلاق صالحہ کی خلاف ورزی پر دینی جائز ہے۔ اگر بچہ کچھ نہ سیکھے تو قصور اُس کا نہیں اُستاد کا ہے۔ وہ کہتا ہے "جب مغنی کے ساز سے ٹھیک آواز نہیں نکلتی تو کیا مغنی ساز کے دوہتڑ مارتا ہے یا اُسے بالائے طاق رکھ دیتا ہے۔ نہیں بلکہ وہ اُسے درست کئے جاتا ہے یہاں تک اُس سے ٹھیک آواز نکلنے لگتی ہے۔"

**تعلیم نسواں** کومی نس عورتوں کے لئے وہی نصاب تعلیم تجویز کرتا ہے جو مردوں کے لئے ہو۔ وہ کہتا ہے کہ "کیا اس کی کوئی وجہ بتائی جا سکتی ہے کہ کیوں صنف نازک پر علم و حکمت کے دروازے بند کر دئے جائیں، خواہ تعلیم مادری زبان میں ہوں یا لاطینی میں؟ خدا نے انھیں بھی اسی طرح صورت اللہ پر خلق کیا ہے جس طرح مرد کو۔ اُسی طرح حدت ذہن اور تیزی فہم انھیں عطا کی ہے جس طرح مرد کو۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ بعض حالتوں میں تو یہ اوصاف اُن میں مردوں سے بھی زیادہ پائے جاتے ہیں۔ پھر کیوں ایسا ہو کہ ہم اُنھیں ابجد تو پڑھا دیں لیکن کتابیں نہ پڑھنے دیں۔ کیا اُن سے کوتاہ اندیشی کا خوف ہے؟ لیکن کوتاہ اندیشی تو بالعموم بےکسری کا نتیجہ ہوتا ہے۔ پھر کیوں ہم اُن کے دماغ کو اعلیٰ خیالات سے پُر نہ کر دیں اور کوتاہ اندیشی کا امکان ہی گھٹا دیں"۔

**تعلیمی درسگاہوں کی چار درجوں میں تقسیم** تعلیم کی ترتیب و تدریج جیسی صحیح اور جیسی واضح کومی نس نے قرار دی ہے، حق یہ ہے کہ اُس سے بہتر ہو نہیں سکتی۔ اُس نے درسگاہوں کو چار درجوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) انفینٹ اسکول (یعنی کنڈرگارٹن) (۲) پرائمری اسکول (مدرسہ ابتدائیہ) (۳) سکنڈری اسکول (مدرسہ ثانویہ) (۴) ہائر اسکول (اعلیٰ درسگاہیں)، تین صدی کا تجربہ اس تقسیم کی تائید کرتا ہے اور اب تو یہ تقسیم مُسلّمات میں سے ہو گئی ہے۔ کومی نس نے ان میں سے ہر درجہ کی مدت تعلیم چھ سال قرار دی ہے۔ اس طریقہ سے گویا ۲۴ سال کی عمر میں تعلیم ختم ہو جاتی ہے۔ درسگاہوں کے مختلف حصوں کی صحیح حدود کومی نس سے پہلے کسی نے نہیں کیں۔ لوتھر نے گو جبری اور مفت ابتدائی تعلیم کی بنیاد ڈالی مگر وہ ابتدائی تعلیم کے لئے حدود قایم نہ کر سکا مثلاً اس نے ابتدائی تعلیم میں بجائے مادری زبان کے لاطینی کو داخل کرنے کی ہدایت کی ہے۔

کومی نس کی تقسیم کے مطابق اب ہم ایک ایک درجہ کو بیان کرتے ہیں۔

(۱) **بچہ کا پہلا معلّم** سب سے پہلی معلّم ماں ہے۔ ماں کو چاہیئے کہ بچّہ کو علم کی اُن شاخوں سے جو وہ پرائمری اسکول میں جاکر پڑھے گا آشنا کردے۔ اُسے جملہ علوم کی ابتدائی باتوں سے واقف کردینا چاہیئے۔ کومی نس ہی پہلا شخص ہے جس نے کنڈرگاٹن (گلزار نونہال) طریقہ تعلیم کا اجمالی ذکر کیا ہے جسے بعد میں پسٹالوزی اور فیروبیل نے مکمل اور مفصل طور پر مرتب کیا۔ کومی نس کہتا ہے کہ بلاشبہ بچّوں کے قوائے ذہنی کے نشو ونما میں بڑے بہت مدد کرتے ہیں مگر جتنی امداد اس میں برابر کے بچّوں سے جن کے اخلاق وعادات ایک سے ہوں، ملتی ہے کسی سے نہیں ملتی۔ آپس میں مل کر کھیلنے اور آپس میں باتیں کرنے سے اُن کی عقل زیادہ اور یقینی طور پر ترقی کرتی ہے۔ کومی نس کہتا ہے کہ بچوں کو مستعدی کی عادت ڈالنی چاہیئے اور انھیں ہر وقت کام میں لگائے رکھنا چاہیئے۔ ہر وقت کام میں لگائے رکھنے کی تشریح ایک اطالوی مصنفہ مونتساری نے تجربہ کے بعد بہ تفصیل تمام اپنی کتاب میں کی ہے۔

(۲) **پرائمری اسکول** پرائمری مدرسوں میں لڑکے اور لڑکیاں چھ برس کی عمر میں داخل ہوتے ہیں۔ ان مدرسوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ساری تعلیم مادری زبان میں ہوتی ہے۔ ان مدرسوں کو ورنیکلر بھی کہتے ہیں کیونکہ اہل روما دیسیوں کی زبان کو ورنیکلر کہا کرتے تھے اور ہندوستان میں بھی یہ لفظ اہل روما سے مستعار لیا گیا ہے اور بدقسمتی سے بُرے معنوں میں استعمال ہونے لگا ہے۔ کومی نس نے صراحت کے ساتھ اس مشکل کو حل کردیا ہے جس پر ہندوستان میں اب تک مختلف کانفرنسوں اور پرائیوٹ طور پر بحث ہوتی رہتی ہے۔ کومی نس نے کہا ہے کہ ابتدائی تعلیم کا پروگرام ایسا بنانا چاہیئے جو بذات خود مکمل ہو اور اُس کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دنیاوی کاروبار کرسکیں اور اسی کے ساتھ اس پروگرام میں یہ خوبی بھی رکھی جائے کہ اُس کے سیکھنے کے بعد مدرسہ ثانویہ کی تعلیم حاصل کرسکیں۔ ان مدرسوں کی تعلیم جبری ہونی چاہیئے اور غریب اور امیر سب کے لئے یکساں ہو۔ تین صدی کے تجربہ کے بعد اب یہ تو مسلّم ہوگیا ہے کہ پرائمری تعلیم جبری ہونی چاہیئے اور

نیز یہ کہ وہ مادری زبان میں ہونی چاہیئے، مگر کومی نس کا دوسرا اصول اب تک لوگوں کے دلنشین نہیں ہوا کہ یہ تعلیم امیر و غریب سب کے لئے ایک ہو۔ ہم اس وقت یہ سُنتے ہیں کہ غیریوں کے لئے اور قسم کی تعلیم کی ضرورت ہے، امرا کے لئے دوسرے قسم کی اور دیہاتیو کے لئے تیسرے قسم کی۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اُمرا کے مدارس الگ ہیں عوام کے مدارس الگ، اور فرمانروایان ملک کے لئے کچھ علیحدہ قسم کی تعلیم ضروری سمجھی جاتی ہے۔ کومی نس کے نزدیک ہر فرد بشر کے لئے خواہ وہ کسی طبقہ کا کیوں نہو ایک ہی قسم کی تعلیم کا سلطنت کی طرف سے مہیا ہونا جبری تعلیم کی دوسری منزل ہے اور جمہوریت واقعی کی پہلی منزل ہے۔ جب تک کہ ملک اس معیار پر نہ آجائے تو اس ملک میں جمہوریت لفظی جمہوریت ہے اصلی نہیں۔

(۳) **سکنڈری اسکول** کومی نس کہتا ہے کہ سکنڈری اسکول کی تعلیم بارہ برس کی عمر میں شروع ہونا چاہیئے اور سب سے پہلے لاطینی شروع کرا دینی چاہیئے اور کسی طالب علم کو فقط اس بنا پر مدرسہ میں لینے سے انکار نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ غریب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سلطنت کا فرض ہے کہ فقط پرائمری اسکول ہی نہیں بلکہ چاروں قسم کی درسگاہیں قایم کرے۔ کومی نس کے اس اصول کا پورا تتبع صرف فرانس میں ہوتا ہے، جہاں ہر قسم کی درسگاہیں سٹیٹ کی طرف سے مفت تعلیم دیتی ہیں اور افلاس کی وجہ سے کسی طالب علم کے اخراج کی نوبت نہیں آتی۔ کومی نس اُس تعلیم کا سخت دشمن ہے جو کورانہ تقلید پر مبنی ہو۔ وہ تاکید کرتا ہے کہ تقلید کے بجائے مادہ اجتہاد پیدا کرنا چاہیئے اور تعلیم کی بنیاد حقایق اشیائ کے مطالعہ اور غور خوض پر رکھنی چاہیئے۔ وہ کہتا ہے۔

> "میں التجا کرتا ہوں اور نہایت ادب کے ساتھ درخواست کرتا ہوں کہ مہربانی فرماکر آپ یہ رائے قایم کرلیجئے کہ آیندہ سے مدارس کا فرض لوگوں کو یقین دلانے کی ترغیب نہ ہونا چاہیئے بلکہ ہر بات کو ثابت کرنا ہونا چاہیئے

یعنی اسکولوں میں یہ نہ کہنا چاہیئے کہ فلاں فلاں بات کو مان لو بلکہ
اساتذہ کا فرض یہ ہونا چاہیئے کہ ہر اصول اور واقعہ کو ثابت
کر کے طلبہ کے ذہن نشین کریں۔ میں التجا کرتا ہوں کہ اسکولوں میں
بجائے لفظی مناظرے کے مشاہدات سے کام لینا چاہیئے اور میں
یہ بھی درخواست کرتا ہوں کہ اسکولوں کا فرض یہ نہو کہ لڑکوں میں
ہر چیز کا یقین پیدا کریں بلکہ فرض یہ ہونا چاہیئے کہ ان کی معلومات
بڑھے۔ ارسطو کا مقولہ کہ "طالب علم پر لازم ہے کہ تسلیم کر لیا کرے"
سخت ظلم ہے اور نہایت مضر ہے اور فیثاغورث کے پڑھانے کا یہ
اصول کہ ہر ایک مسئلہ کو "قال الشیخ" سے شروع کرے اُسی قدر خوفناک
اور تعلیم کو روکنے والا ہے جیسا کہ ارسطو کا مقولہ"۔

اے کاش کومی نس کے یہ اصول مسلمان معلّموں کے دل میں جا گزیں ہو جائیں!! مسلمان آٹھ صدی تک ارسطو و فیثاغورث کے اصول تدریس کا نہایت اہتمام کے ساتھ تتبع کرتے رہے ہیں بلکہ اُنھوں نے اُس میں اس قدر مبالغہ کیا کہ شاید خود ارسطو و فیثاغورث کا منشاء بھی یہ نہ تھا۔ اور اب بھی ہمارے دیسی مکاتب اور مدارس میں اسی اصول کی نہایت شد و مد کے ساتھ پابندی کی جاتی ہے۔

کسی زبان کے سکھانے میں ابتدا صرف و نحو سے کرنی کومی نس کے نزدیک سخت غلطی ہے وہ کہتا ہے کہ "زبان کو قواعد سے نہیں بلکہ استعمال سے سیکھنا چاہیئے۔ یعنی پڑھنے لکھنے، نقل کرنے اور بول چال سے۔ زبان کے صحیح استعمال کے قاعدے یعنی صرف و نحو زباندانی سے مقدم نہیں موخر ہیں"۔ زبان کو پوری طرح قابو میں لانے کے لئے کومی نس ناٹک کرنے کی بھی رائے دیتا ہے کیونکہ ناٹک بچوں کے تلفظ کی صحت اور جھجک کے رفع کرنے کے علاوہ ان کے اور اُن کے والدین دونوں کے لئے موجب تفریح ہوتا ہے۔

کومی نس تعلیم کی تعریف یوں کرتا ہے کہ تعلیم کی غایت مدنی ہے اور اس سے مقصود ہے شاگرد کو زندگی کے اعمال اور تمنّیات کے لئے بدیں نظر تیار کرنا کہ وہ اپنے حالات خاص کے اعتبار سے کیونکر اپنی حالت کو قائم رکھ سکتا ہے اور کس طرح اُسے ترقی دے سکتا ہے۔ لیکن رسکن Ruskin سے بہتر کومی نس بھی تعلیم کی تعریف نہ کر سکا اور حق یہ ہے کہ رسکن سے بہتر تعریف شاید ہی کسی نے تعلیم کی غرض و غایت کی کی ہو۔ رسکن کہتا ہے کہ تعلیم یہ نہیں ہے کہ وہ باتیں جو ہم نہیں جانتے جان جائیں بلکہ تعلیم سے مُراد ہے کہ ہمارا طرز عمل ایسا ہو جائے جیسا کہ نہیں ہوتا یعنی تعلیم کا مقصد جہالت کو دُور کرنا نہیں ہے بلکہ طرز عمل کو سنبھالنا ہے۔ تعلیم کا معیار ذخیرہ معلومات نہیں ہے بلکہ اُس کا معیار ہیں اخلاق و عادات ملکات اور غایات۔ معلومات کی فکر تو ان سب کے بعد اور ان سب سے کم کرنی چاہیئے۔

## جان ملٹن JHON MILTON.

جان ملٹن جو ایک شاعر بے عدیل تھا ۱۶۰۸ء میں بمقام لندن پیدا ہوا۔ اس کا باپ دیانت و راستبازی میں مشہور تھا اور ماں صفات حسنہ اور فیاضی میں امتیازی حیثیت رکھتی تھی ۱۴ سال کی عمر سے ۲۱ سال کی عمر تک کرائسٹ کالج کیمبرج میں اس نے تعلیم حاصل کی۔ اور یہ سات برس کی مدّت اُن ایام میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے ضروری تھی۔ کالج کے عقب میں وہ جگہ جہاں وہ چہل قدمی کیا کرتا تھا اب تک Milton's walk کے نام سے مشہور ہے۔

تعلیم کے متعلق اس کے خیالات ایک خط میں مندرج ہیں جو ہارٹ لب نامی ایک امیر باشندہ پولینڈ کے نام اس نے لکھا تھا جو اُس زمانہ میں لندن میں اقامت گزیں تھا۔ یہ خط ۱۶۴۴ء میں بعنوان "رسالہ تعلیم" شائع ہوا۔ ملٹن نے زبان انگریزی کی صرف و نحو کی کتاب بھی لاطینی زبان کی صرف و نحو کے طرز پر تصنیف کی۔

کامن ولیتھ (Common wealth) کے مصیبت ناک زمانہ میں ملٹن کے وقائع زندگی پر نظر ڈالنا اور ان خطرات و مصیبتوں کی داستان بیان کرنا جو شہنشاہی قایم ہونے کے زمانہ میں پیش آئیں، یا اس کے دل آزار مناظر کی معرکہ آرائیوں اور خانگی تکلیفوں کا حال لکھنا اس مضمون کی وسعت سے باہر ہے۔

**تعلیم کے بارے میں ملٹن کی رائے** کومی نس کی طرح ملٹن بھی لفظ سے زیادہ اشیاء اور حقایق کے مطالعہ کی تائید کرتا ہے لیکن اس کا رجحان طبع ہے کہ بجائے کومی نس کی کتاب "تعلیمات" کے پڑھنے کے پلوٹارک اور کوئنٹلین کی تصنیفات کا مطالعہ کیا جاوے۔ شاید اس کی وجہ موخرالذکر تصنیفات کی سلاست بیان و خوبی زبان ہو۔

ملٹن کی رائے میں جدید زبان کے سیکھنے میں الفاظ و محاورات کے ساتھ ساتھ حقایق کا جاننا ضروری ہے ورنہ سیکھنے والے کو کبھی عالم کا رتبہ حاصل نہیں ہو سکتا اور اس کی مثال اس تاجر کی سی ہوگی جو کسی زبان کو عملی طور سے سیکھکر اپنے کاروبار کے لئے استعمال میں لائے۔ ملٹن اس طریقہ کی بہت مذمت کرتا ہی کہ کم سمجھ بچوں کو مافوق العادت محنت کے ساتھ شعر اور نظم لکھنے اور فصیح تقریریں کرنے کی مشق کرائی جائے۔ حالانکہ یہ کام پختہ عقل والوں اور تجربہ کار لوگوں کے ہیں جن کے دماغ کثیر مطالعہ اور مدت کے مشاہدات و تجربات کے بعد اس کام کے موزوں ہوتے ہیں۔

**تعلیم کا پروگرام** ملٹن نے تعلیم کا جو پروگرام قرار دیا ہے وہ بہت زیادہ ہے اور اوسط درجہ کے اُستاد کی استطاعت سے باہر ہے اس پروگرام کے لحاظ سے ایک شاگرد کو تقریباً ہر مضمون کی تعلیم حاصل کرنا ضروری ہی یعنی جغرافیہ، علم مثلث، قلعہ بندی، انجینیری، فن جہاز رانی، اور طبعیات (جو آسان طریقہ پر لکھی گئی ہو) اس کے بعد اس کو کامڈی اور ٹرجڈی یعنی لٹریچر رزم و بزم پڑھنا چاہیئے۔ اور پھر قانون کو اچھے طریقہ سے سیکھنا چاہیئے اور تمام وہ قوانین سیکھنے چاہئیں جو مختلف حکومتوں نے بنائے مثلاً بنی اسرائیل کے قوانین مجوزہ حضرت موسیٰ

علیہ السلام، یونانیوں کے قوانین مجوزہ لائی کرگس Lycurgus اور روما کے قانون مجوزہ جسٹینین Justinian وغیرہ۔ ورزش کے اوقات میں شاگردوں کو کشتی، موسیقی، شہسواری اور جہازرانی کی مشق کرنا چاہیے۔ اور اتوار کے روز عبرانی، سیریانی اور کلدانی زبانیں سیکھنا چاہئیں۔ اور درمیان میں کبھی کبھی اگر وقت ملے تو اطالوی بھی سیکھنا چاہیئے۔ گویا ملٹن کے نزدیک ہر شخص کو ایک زندہ مجسم انسائیکلو پیڈیا بن جانا چاہیئے۔ لیکن کوئی شخص اس نصاب کے مطابق تعلیم حاصل نہیں کرسکتا، جس کی عقل و فراست فلاسفر مل Mill سے کم ہو اور کوئی شخص اس کی تدریس نہیں کرسکتا کہ جو ملٹن کے طریقہ تدریس سے واقف نہ ہو۔ معمولی فہم والے معلّم یا طالب علم کے لئے ملٹن کے پروگرام کی پیروی ناممکن ہے۔ ملٹن نے گویا ان فارغ البال طلبہ کے لئے جن میں غیر معمولی ذہانت بھی ہو اور جو عالم فاضل ہونے کے خواہشمند ہوں یہ پروگرام مقرر کیا ہے ورنہ عام لوگوں کی تعلیم سے اس کو کچھ علاقہ نہیں۔

## لاک LOCKE

تمام انگریزی ماہران فن تعلیم میں لاک کا درجہ و رتبہ نہایت ممتاز ہے۔ اور فی زمانتا تعلیم کے جن اصول کا اتباع انگلش پبلک اسکولوں میں کیا جاتا ہے ان سب کا مخزن لاک کے قائم کردہ اصول ہیں۔ روسو کی تحریرات کا منبع بھی لاک کی کتاب "خیالات متعلق تعلیم" ہے۔ لائبنٹز Leibnitz اس کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہے اور اس کی بہت توقیر و تعظیم کرتا ہے۔ تاریخ تعلیمات کے مسلّم الثبوت ماہر کارل اشمٹ (Karl Schmidt) کا قول ہے کہ لاک کا درجہ فن معلّمی کی تاریخ میں بعینہ وہی ہے جو دنیا کی تاریخ میں اقوام یورپ کو حاصل ہے۔

لاک کی پیدائش ۱۶۳۲ء کی ہے۔ اس کا باپ وکالت کرتا تھا، اور ابتدائی اثرات اور عمدہ خصوصیات اس نے اپنے باپ سے حاصل کئے۔ اس نے اوّلاً ویسٹ منسٹر اسکول میں

اور زاں بعد کرائسٹ چرچ کالج آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کی ۱۶۵۸ء میں لاک نے اپنی پہلی تصنیف شائع کی۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ یہ تصنیف نظم میں تھی۔ جس پر بعض جگہ اس نے اپنی کتاب موسومہ "خیالات متعلق تعلیم" میں نکتہ چینی کی ہے۔ ۱۶۵۸ء میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور ڈگری حاصل کرتے ہی طالب علمی کی بنچ سے پروفیسری کی کرسی پر متمکن ہو گیا۔ اور اس زمانہ میں بوجہ اپنے عزیزوں کے انتقال کے اپنے خاندان میں یکہ و تنہا رہ گیا تھا۔ یہ زمانہ خانہ جنگیوں کا تھا اور شہنشاہی کے تسلط کو اس نے آیہ رحمت سمجھا اور کامن ویلتھ (جمہوریت) پر حسب ذیل الفاظ میں نکتہ چینی کی ہے:۔

"میں سمجھتا ہوں کہ عام آزادی مرادف ہے عام غلامی کے اور آزادی عامہ کے مقبول انام مبلغ عام آزادی کے سب سے زیادہ سلب کرنے والے ہیں۔"

۱۶۶۵ء میں لاک کو ارل آف سینڈوچ کی سکرٹری شپ اور اسپین میں ایلچی کا عہدہ ملتا تھا۔ تھوڑی عرصہ تک وہ اس کے قبول کرنے یا نہ کرنے کے متعلق عالم تذبذب میں رہا اور سوچتا رہا کہ آیا یہ وہی بیش بہا موقعہ ہے جو ہر شخص کو زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ایک ہی مرتبہ ملتا ہے۔ بالآخر اس نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس سے ایک سال بعد اس کی واقفیت لارڈ شافٹس بری سے ہو گئی، جس سے اس کا تعلق ہمیشہ مشیر طبی، اتالیق، پرائیوٹ سکرٹری اور محب خاندان کی حیثیت رہا۔ لارڈ شافٹس بری Lord Shafesbury سے اس کے تعلقات کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ لارڈ موصوف کے بیٹے کی دلہن انتخاب کرنے کی نازک خدمت اس ہی کے سپرد کی گئی تھی۔

۱۶۶۸ء میں رائل سوسائٹی کا فیلو منتخب ہوا اور ۱۶۷۲ء میں لارڈ شافٹس بری جب انگلستان کے وزیر اعظم ہوئے تو وہ ان کا سکرٹری ہو گیا، اور جب لارڈ موصوف انگلستان سے خارج البلد کئے گئے تو لاک بھی وفادارانہ طور سے ان کی معیت میں ہالینڈ میں رہا اس کے خلاف یہ الزام ناانصافی پر مبنی ہے کہ اس نے انگریزی حکومت کے خلاف مغویانہ

پمفلٹ لکھے اور اسی شبہ میں آکسفورڈ کی فیلوشپ سے اسے محروم کیا گیا۔ ۱۶۸۸ء میں جب ولیم اور میری تخت حکومت پر بیٹھے تو لاک بھی انگلستان کو واپس آیا۔

عام معاملات و مسائل پر بہت کشادہ دلی کے ساتھ گفتگو کیا کرتا تھا، مگر پرائیوٹ معاملات اور کسی کی ذاتی رائے کے متعلق خاموشی کو اظہار رائے پر ترجیح دینے کی صفت اس کو حاصل تھی۔ ۱۶۸۹ء میں اس نے اپنے مشہور فلسفہ کی کتاب موسوم بہ "عقل انسانی" شائع کی اور ۱۶۹۳ء میں "خیالات متعلق تعلیم" کو چھپوایا۔

۱۷۰۲ء نیوٹن سے لاک کی ذاتی واقفیت ہوگئی، جس کے متعلق اس نے اپنی یہ رائے ظاہر کی ہے کہ وہ "نہ صرف اس اعتبار سے قابل قدر شخص ہے کہ علوم ریاضی میں حیرت انگیز فراست اس کو حاصل ہے بلکہ دینیات میں بھی شاید ہی کوئی اس کا ہمسر ہو۔"

**تعلیم کے بارے میں لاک کی رائے**

آخری عمر تک لاک خوش طبع و خوش مزاج رہا اور ۱۷۰۴ء میں خاموشی کے ساتھ اس سرائے فانی سے کوچ کر گیا۔ لاک کی رائے کے مطابق تعلیم کا مقصد و منشا یہ ہے کہ تندرست و صحیح دل و دماغ جسم میں پیدا ہو اور یہی تعریف تعلیم کے تمام اصولوں کا محور ہے۔ اس تعریف کی تشریح لاک نے خود کی ہے اور یہ بیان کیا ہے کہ یہ مطمح نظر کیونکر حاصل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس کی رائے ہیں اس کے لئے ان چار باتوں کی ضرورت ہے (۱) نیک عادات و خصائل حسنہ کا پیدا ہونا (۲) دانائی و فراست (۳) اطوار پسندیدہ یا عمدہ تربیت (۴) حصول علم۔ تعلیم حاصل کرنے پر ہم کو پوری توجہ اوّل الذکر خصائل پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور اسی کے ساتھ علم حاصل ہو جائے تو وہ لہنا دینی ہے جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ لاک کے نزدیک لکھنا پڑھنا جاننا تعلیم کے لئے ضروری نہیں ہے ایک ناخواندہ آدمی بھی عمدہ تعلیم یافتہ کہا جا سکتا ہے اور بہت سی مجلد کتابوں کو ازبر جاننے والے، ارسطو کے فلسفہ سے واقف اور دنیا کی مختلف زبانوں میں آسانی کے ساتھ گفتگو کرنے والے لوگ غیر تعلیم یافتہ کہلائے جا سکتے ہیں ایسے اشخاص

کو شیخ سعدی نے بھی جانور ہی بتلایا ہے ع

چار پائے برو کتابے چند

دنیا میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ علاء الدین خلجی اور اکبر اعظم اگرچہ اُمّی محض تھے
مگر جس دانائی و فراست کے ساتھ ان دونوں نے عرصہ دراز تک ملک ہندوستان پر
حکومت کی اس کے لحاظ سے یقیناً ہم ان کو باوجود اُمّی ہونے کے اعلیٰ درجہ کا تعلیم یافتہ
کہیں گے۔ اس سے بھی زیادہ روشن مثالیں اس خیال تائید میں دنیا کی تاریخ میں ملتی ہیں
کہ باوجود کتابی تعلیم حاصل نہ کرنے کے بعض افراد نے اپنی فطری ذہانت و طباعی کی بدولت
ایسے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں جو اپنا آپ نظیر ہیں اور عرف عام کے اعتبار سے
اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی کتابی تعلیم پائے ہوئے کروڑوں اشخاص ان کے سامنے کوئی درجہ
نہیں رکھتے۔

لاک ہی پہلا مُبصر تعلیم ہے، جس نے ایک باقاعدہ رسالہ بچوں کی غذا، لباس، اور
اُن کی نیند کے متعلق تحریر کیا ہے۔ اس کا قول ہے کہ:۔

"جسم کی پرداخت بالکل با در فطرت پر چھوڑ دو کہ جس طرح چاہے کرے"۔

اور اسی لئے اس کی رائے ہے کہ کپڑے چست و تنگ نہوں، کھلی ہوا اور دھوپ میں ننگے
سر اور ننگے پاؤں بچے کھیلیں تاکہ گرمی و سردی کی برداشت کا مادّہ ان میں پیدا ہو
وہ چاہتا ہے کہ بچوں کو کھلی ہوا میں خوب ورزش کرنے کا موقعہ ملے اور وہ جی بھر کر
سوئیں۔ غذا سادہ ہو اور شراب یا محرّک چیزیں مثلاً چائے اور کافی پینے کو نہ دی جائیں
اور ننگے پاؤں ٹھنڈے پانی اور راہوں و شبنم پر چلنے کے وہ عادی ہو جائیں۔

(نہایت خوش قسمتی کی بات ہے کہ شاید والدین نے کبھی بچوں کو ننگے پاؤں سردی کے
موسم میں کیچڑ پانی میں پھرنے کے عادی بنانے کا تجربہ نہیں کیا، ورنہ اُن کو وہی تلخ تجربہ
ہوتا جو پیٹر اعظم کو ہوا تھا، جس نے ایک دن یہ خیال اپنے دماغ میں پیدا کیا کہ ملاح اگر

آب شور پینے کے شروع ہی سے عادی ہو جائیں تو بہت خوب ہو اور پھر جہازوں پر میٹھے پانی کے مہیا کرنے کی زحمت نہ ہو۔ خیال آنے کی دیر تھی کہ ایک فرمان جاری ہو گیا کہ تمام طلبائے بحری اس وقت سے صرف آب شور پئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان بیچاروں میں سے کوئی طالب علم بھی جاں بر نہ ہو سکا)

تعجب ہے کہ لاک بچوں کو مقررہ اوقات پر غذا کھلانا پسند نہیں کرتا۔ برخلاف اس کے فینی لن Fenelon نہایت دانشمندانہ طور پر خواہش کرتا ہے کہ کھانے کے اوقات پورے طور سے مقرر و معین کئے جاویں۔

اب ہم اُن تین امور کی تشریح کرتے ہیں جن کا حصول لاک کے نزدیک تعلیم کے لئے ضروری ہے:۔

نیک عادات و خصائل حسنہ:۔

(۱) پاک بازی نیکی کی جڑ ہے اور ذات باری کے سچے اعتقاد پر مبنی ہے جو حقیقی مذہبی تعلیم شروع ہونے سے قبل بچہ کے دل میں راسخ ہونا چاہیئے۔ ذات باری کا اعتقاد رفتہ رفتہ بچے کو سکھلانا چاہیئے اور بچوں کی عمر کے مناسب ان کو بہت سادہ طور سے عبادت کرنا بتلانا چاہیئے (۲) دوسری صفت نیک قوۃ ارادی ہے، یعنی انسان خواہش نفسانی کو عقل کا تابع کرے۔ خواہش نفسانی پر غلبہ اسی صفت کی بدولت ہو سکتا ہے۔ اس کی تربیت اس طرح ہو کہ نیک صفاتی طبیعت ثانیہ بن جائے (۳) عادت کے دوش بدوش مثال اور نمونہ ہے۔ اخلاق کی تعلیم بچوں کو زبان سے نہیں بلکہ عمل اور نمونہ سے دی جائے[1]۔

دانائی و فراست

عقل و فراست سے لاک کا مطلب ایسی قابلیت ہے جس کے ذریعہ سے ایک انسان اپنے

---

[1] جو کچھ لاک کا مقصود ہے اس کو چند الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ خواجہ حافظ نے اس خیال کو اس مصرعہ میں ظاہر کیا ہے،

ع۔ با دوستاں مروت با دشمناں مدارا۔ اور یہی تمام نیک عادات و خصائل حسنہ کا خلاصہ و نچوڑ ہے۔

کاروبار کو دوراندیشی کے ساتھ انجام دے سکے۔ فطرت انسانی کا اس کو علم ہو، اور دانائی کے ساتھ عمل کرنے کی قابلیت ہو۔ یہ صفات بہ نسبت علوم منطق و مابعد الطبیعات کے زیادہ سودمند و کارآمد ہیں۔ بچوں کو دنیا کی صحیح اور اصلی حالت کا خاکہ ذہن نشین کرنا چاہیئے۔ بصیرت کے معنی یہ بھی ہیں کہ آدمی دنیا کے واقعات دیکھکر صحیح رائے قایم کرے اور ان صحیح رایوں سے صحیح نتیجہ نکالے۔ ہر موقعہ اور ہر محل پر اپنی رائے مستقل مزاجی کے ساتھ قایم رکھے اور عوام کی رائے کا غلام نہ ہو۔

عمدہ تربیت و پسندیدہ اطوار

عمدہ تربیت یا پسندیدہ اطوار کا حصول بھی تعلیم کا مقصود ہونا چاہیئے۔ عمدہ تربیت سے مراد ہی الفاظ وافعال کی عمدگی، دلی خوش اخلاقی اور عملی کاموں میں مناسب آداب کا لحاظ رکھنا۔ عمدہ تربیت میں بہت سی صفات شامل ہیں جو اس قاعدہ پر عمل کرنے سے حاصل ہوسکتی ہیں کہ "ہم کو خود اپنی ذات اور دوسروں کے متعلق کوئی ذلیل خیال نہیں قائم کرنا چاہیئے" یہ وہ خصوصیت ہی جو ہر قسم کی تحصیل علوم سے زیادہ احسن ہی۔ اسی وجہ سے قدیم خاندانوں کے افراد جن میں روایات قدیم سینہ بسینہ چلی آتی ہیں وہ اپنے بچوں کو اسکولوں میں بھیجنے کے مخالف رہے ہیں کہ مبادا تحصیل علم کی بدولت ہم اس خصوصیت کو کھو بیٹھیں۔ اس خاص خصوصیت کی تشریح الفاظ سے ممکن نہیں ہی۔ طرز عمل اس کی موجودگی یا عدم موجودگی کو فوراً بتلا دیتا ہے۔

لاک کی رائے میں حصول علم میں نہایت ادنیٰ جز تعلیم و تدریس کا ہی۔ اور تعلیم کے جو اغراض اس نے قرار دئے ہیں اُس کے لحاظ سے تدریس کی جگہ سب کے آخر میں ہی۔ اپنے زمانہ کے پبلک اسکولوں کے طریقہ کو لاک نے نہ صرف اخلاق، چال چلن اور تربیت کے لحاظ سے ناپسند کیا بلکہ اس کی رائے میں جن علوم کی اُن میں تعلیم دی جاتی تھی اور جس طریقہ سے دی جاتی تھی وہ خود نہایت درجہ ناقص تھا اس نے زباندانی کے طریقہ تعلیم پر نکتہ چینی کی ہے جو اُس زمانہ میں زیادہ تر نظم نویسی اور صرف و نحو کے قواعد کے مشق کرنے سے ہوتی تھی۔ نظم نویسی کے متعلق جبریہ مشق کرانے کی

بابتہ لاک نے جو کچھ کہا ہے وہ اُسی کی زبان سے سُننا چاہیئے۔ وہ کہتا ہے:-

**شاعری کے متعلق لاک کی رائے**

"اگر کسی لڑکے میں شعر شاعری کا مادّہ نہیں ہے تو یہ بات حد درجہ ظلم پر مبنی ہے کہ بچّہ کو ایک ایسی چیز کے حاصل کرنے کی مصیبت میں ڈالا جائے اور اُس کے وقت کو ایسی چیز کے متعلق ضائع و رائیگاں کیا جائے، جس میں وہ کبھی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ اور اگر اس میں شاعری کا مادّہ ہو تو میں اُس کو دنیا کے عجائبات میں سے سمجھتا ہوں کہ ایک باپ اپنے لختِ جگر میں اس صفت کو ترقی اور جلا دینے کی خواہش کرے، کیونکہ شاعری سے آج تک کسی نے سونا اور چاندی حاصل نہیں کیا۔ یہ ایک ایسا میدان ہے جس کی آب و ہوا خوش گوار ہے مگر زمین بنجر ہے۔ شاعری اور قمار بازی کی حالت بالکل یکساں ہے کیونکہ شاذ و نادر ہی ان سے کسی کو کچھ فائدہ حاصل ہوتا ہے بجز ان لوگوں کے جن کا ذریعہ معاش کچھ اور نہیں ہے"

**حفظ یاد کرنے اور رٹنے کی ممانعت**

لاک نے حفظ یاد کرنے یا رٹنے کی عام طور سے سخت مذمت کی ہے چنانچہ وہ کہتا ہے کہ "ایک خورد سال بچّہ یا لڑکے کے حافظہ پر لمبے لمبے فقروں کے رٹنے کا بار ڈالنا جس کو وہ یا تو اچھی طرح سمجھتا نہیں یا بالکل ہی نہیں سمجھا ایک ایسا ظالمانہ اور احمقانہ طریقہ ہے کہ اس سے زیادہ ظالمانہ اور احمقانہ طریقہ خیال میں نہیں آ سکتا۔ یہ ایک ایسا عجیب چٹکلا ہے جو اُلٹی کھوپڑی کے معلّموں نے ایجاد کیا اور ناواقف والدین نے اس کو رائج ہونے دیا اور اس کی بدولت ادبیات اور دیگر درسی کتب سے انگریزی قوم کی بہت سے نوجوانوں کو متنفر کر دیا۔"

یہ رائے موجودہ زمانہ میں کسی مبصرِ تعلیم کی نہیں ہے اور لاک نے جو کچھ کہ شاعری کے متعلق لکھا ہے اُس سے موجودہ معلّم غالباً متفق نہ ہوں گے۔ عمدہ نظمیں حقیقتاً ان اوقات میں نہایت تسکینِ خاطر کا باعث ہوتی ہیں جبکہ طبیعت مضمحل اور پراگندہ ہو۔ اور کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کو کبھی نہ کبھی پراگندگیِ خاطر نہ ہوا ہو اور اگر موقع اور محل کے مطابق مناسب اشعار پڑھے جائیں تو وہ انسان کے جذباتِ حسنہ کو عمل میں لانے کے لئے جو کام کرتے ہیں۔ وہ کسی اور ذریعہ سے ممکن نہیں۔

**بچّوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ**

بچّوں کے ساتھ درشتی آمیز تاؤ کا لاک حامی نہیں ہے اور اُس کی رائے میں قمچی سے سوائے اس وقت کے کام نہیں لینا چاہیئے جبکہ کوئی جرم جان بوجھ کر اور ہٹ دھرمی کے ساتھ گستاخانہ طور پر سرزد نہ ہو۔ اور تمام حالتوں میں بچّہ کے شریفانہ جذبات کو برانگیختہ کرنا چاہیے۔ لاک کا قول ہے۔ کہ "قمچی کا استعمال غلامانہ ڈسپلن کا طریقہ ہے جس سے غلامانہ مزاج قایم ہو جاتا ہے" اس کی رائے میں شریفانہ جذبات کو متحرک کرنے میں صحیح تعلیم کا راز مضمر ہے۔ فرقہ جیسیٹ و مُٹس کی طرح وہ اس بات کا حامی نہیں ہے کہ بچّوں میں منافست یا حسد و غبطہ کے جذبات کو اُبھارا جائے۔

انگریزی مدارس میں لاک کی قمچی کے استعمال کے اصول کی پابندی بہت کم کی جاتی ہے اور بہ نسبت فرانس اور جرمنی کے اساتذہ زیادہ سختی کے ساتھ قمچی کے استعمال پر مُصر ہیں۔ اس سلسلہ میں مندرجۂ ذیل حکایت دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔

۱۸۱۸ء میں ڈاکٹر رسال ہیڈ ماسٹر چارٹر ہاؤس نے سزائے جسمانی کو متروک کر دیا اور بجائے اس کے سزائے جرمانہ قرار دی۔ اس جدّت کی ہر شخص نے مخالفت کی۔ اُستادوں اور شاگردوں کو قمچی کا استعمال ایک شریف شخص کی عزت و حرمت کے عین مطابق نظر آتا تھا اور جرمانہ کی سزا شرمناک معلوم ہوتی تھی۔ چنانچہ اس حکم کے اجرا پر یہ نعرہ بلند ہوا کہ "جرمانہ جائے جہنم میں! قمچی کو خدا سلامت رکھے۔" نتیجہ یہ ہوا کہ بلوہ آرائی کو فتح ہوئی اور قمچی کا استعمال بحال رہا۔ ایک طالب علم کا جو اس مدرسہ میں موجود تھا بیان ہے کہ سزائے جرمانہ موقوف ہونے کے اگلے ہی دن بعد تمام کلاسوں کے کمروں میں قمچیاں ہی قمچیاں نظر پڑتی تھیں اور اسکول کے اوقات کے دو گھنٹوں میں قمچی کا نہایت تحمّل اور بردباری کے ساتھ استعمال ہوتا رہا۔

لاک کی رائے میں شاگرد کو اس وقت تک صرف و نحو نہیں پڑھانا چاہیئے جب تک کہ وہ اس زبان میں اس قدر مہارت نہ حاصل کر لے کہ روانی کے ساتھ اس میں گفتگو

کرنے کے قابل ہو جائے[1]۔ صرف و نحو بڑھانے کا مناسب وقت گویا فصاحت و بلاغت کی تعلیم کا پیش خیمہ ہے۔ لاک کا قول ہے کہ "میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایک شخص جو لاطینی زبان کا مبصر ہونا نہیں چاہتا یا اُس میں تقریر کرنے اور یاد داشتیں تیار کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا وہ کیوں اپنا وقت لاطینی صرف و نحو کے متعلق ضائع کرے اور اپنا دماغ خالی کرے"

**مضامین درس کے متعلق لاک کی رائے**

صرف و نحو کے بعض قاعدے بغیر اس کے کہ ان کو ایک علیحدہ شکل میں سکھلایا جائے کتاب پڑھتے وقت رفتہ رفتہ بتلا دینے چاہئیں۔

مضامین تعلیم کے لئے جو اصول لاک نے قائم کئے ہیں ان سے ہم نصاب تعلیم بنا سکتے ہیں اور وہ یہ ہیں۔

(۱) مادری زبان کو خاص امتیازی درجہ دینا چاہیئے۔ اس کا قول ہے کہ "میں سمجھتا ہوں کہ ہر شخص اتفاق رائے کرے گا کہ جو شخص کسی زبان کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے تو وہ زبان اس کی ملکی زبان ہونا چاہیئے تا کہ وہ اس کو پوری صحت کے ساتھ بول اور سمجھ سکے۔ ۔ ۔ ۔ کیا اس سے زیادہ کوئی بات مضحکہ انگیز ہو سکتی ہے کہ ایک باپ اپنا روپیہ اور اپنے لڑکے کا عزیز وقت رومن زبان سکھلانے میں ضائع کرے جبکہ وہ اپنے بچّہ کو تجارتی کاروبار کے لئے تیار کرتا ہے"

کومی نس (Comenius) لاک (Locke) اور ان کے پیرووں کے اثر کی وجہ سے یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ تعلیم مادری زبان سے شروع ہونا چاہیئے اور نصاب تعلیم میں سب سے زیادہ امتیازی جگہ مادری زبان ہی کو حاصل ہو۔

(۲) علاوہ مادری زبان کے ہم کو غیر ممالک کی زبانیں بھی سکھلانا چاہئیں لیکن صرف وہی زبانیں جن سے آیندہ چل کر کام پڑے۔ جلب منفعت کے اصول کو نصاب تعلیم قرار دیتے

[1] اس کے برخلاف ہمارے یہاں کسی غیر زبان کی تعلیم صرف و نحو ہی سے شروع کی جاتی ہے۔ صرف و نحو تو فی الحقیقت زبان کو صحیح طور سے استعمال کرنے اور درستی سے بولنے کے لئے بطور آلہ کے ہے۔ اپنا بہت سا قیمتی وقت محض اس آلہ کے حصول پہ صرف کرنا اور اصل مقصد کو نظر انداز کر دینا ہرگز عمدہ اصول نہیں ہو سکتا۔

وقت نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ اس اصول پر سب سے پہلے لاک نے مضامین کا انتخاب کرتے وقت عمل کیا۔

(۳) علوم ریاضیہ کی تعلیم وہ اس غرض سے نافذ کرتا ہے کہ طلبہ میں استخراج نتائج کا مادّہ اچھی طرح پیدا ہو۔ وہ کہتا ہے کہ "اس لئے نہیں کہ میں اس امر کو ضروری سمجھتا ہوں کہ سب لوگ کامل ریاضی داں ہو جائیں بلکہ اس لئے کہ ریاضی کی تعلیم سے استخراج نتائج کا مادّہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کی تربیت سے وہ دیگر علوم میں حسب موقع کام لے سکتے ہیں"

(۴) تعلیم میں مختلف علوم اور مختلف پہلو ہونے چاہئیں۔ علم مذہب، سائنس، فلسفہ، علم الالسنہ وغیرہ پر تعلیم مشتمل ہونا چاہیئے کہ تنگ نظری نہ پیدا ہو۔

(۵) تعلیم میں الفاظ کی واقفیت اور اشیاء کی واقفیت دونوں ہونا چاہئیں۔

(۶) لاک کی رائے ہے کہ تاریخ جغرافیہ اور سائنس کی تعلیم اُن غیر زبانوں میں دی جائے، جن کو حاصل کرنا طالب علم کا مقصد ہو۔ اس کا قول ہے کہ "اگر یہ علوم غیر زبان کی تھوڑی واقفیت حاصل کرنے کے بعد غیر زبان میں پڑھائے جائیں تو نہ صرف ان علوم سے واقفیت حاصل ہوگی بلکہ اسی کے ساتھ غیر زبان کی واقفیت بھی بڑھتی رہے گی"

(اس اصول کا سودمند ہونا مشتبہ ہے۔ گزشتہ دو صدیوں کا تجربہ متفقہ طور سے اس اصول کے خلاف ہے)

(۷) لاک کی رائے ہے کہ جسمانی تربیت کے لئے کوئی پیشہ اختیار کیا جائے۔ اور اس کے نزدیک کسی ایک پیشہ کا سکھانا عام تربیت کے لئے ضروری ہے اور اسی بنا پر مدارس کے نصاب میں نجّاری اور لوہاری کے کام مینوئل ٹریننگ کے نام سے شامل کئے گئے ہیں۔

(۸) لاک اس کا بھی خواہشمند ہے کہ طلبہ کسی نہ کسی قسم کا کاروبار کرنا جان لیں۔ روسو بھی لاک کا موید ہے مگر اور وجوہ کی بنا پر۔ نجّاری یا زراعت کا پیشہ سیکھنے میں لاک کا مقصود خاص کر یہ ہے کہ اس جسمانی ریاضت سے طلبہ کے خیالات میں ایک وقتی تبدیلی پیدا ہوگی اور ان کے دماغ پر سے بہت کچھ بار ہلکا ہو کر آرام ملے گا اور جسم کے لئے مفید ورزش ہوگی۔ روسو چونکہ

انقلاب فرانس کے زمانہ میں تھا اس لئے اس کے وجوہ بالکل مختلف تھے۔ یعنی اُس کی رائے میں اگر کسی انقلابی حالت میں طالب علم اپنی دولت سے محروم ہو جائے تو ضرورت کے وقت کسی پیشہ کا علم یا ہنر اس کو مدد دے سکے۔

نصابِ تعلیم | لاک کے مندرجہ بالا خیالات اور اصول کے لحاظ سے اب ہم بآسانی نصاب بنا سکتے ہیں۔

(۱) علم الالسنہ۔

مادری زبان۔ فرانسیسی اور لاطینی۔

(وہ یونانی زبان پسند نہیں کرتا، البتہ ان لوگوں کے لئے جو کلاسیکل اسکالر (زبان قدیمہ کے ماہر) بننے کے خواہشمند ہوں)

(۲) علوم عامہ

ریاضی، علم ہیئت، جغرافیہ، علم الانساب اور تواریخ، طبعی تاریخ یعنی طبعیات اور علم حیوانات و نباتات۔ علم الاخلاق۔ قانون اور مذہب۔

(۳) جسمانی تعلیم کے مضامین۔

نقاشی، پینٹنگ (مصوری) ناچ، بنوٹ، شہسواری اور دیگر صنعت و حرفت مثلاً بخاری (جن کو وہ پیشہ سے موسوم کرتا ہے)

طریقۂ تدریس | طریقۂ تدریس کے متعلق اس نے حسب ذیل نہایت صحیح مشورہ دیا ہے:۔

(۱) طریقۂ تعلیم بطور کھیل کے ہو تاکہ پڑھنے کو بچے ایک خوشگوار مشغلہ خیال کریں اور اس میں ان کے دماغ کو بالکل آزادی ہو اور اس پر کوئی جبر نہ کیا جائے۔

(۲) تعلیم اس طرح دی جائے کہ بچوں کی توجہ کو گھیرے رہے۔ اُستاد کو یاد رکھنا چاہیئے کہ شاگردوں کو قاعدے یاد کرا دینا کچھ چیز نہیں ان میں عادات کو راسخ کرنا چاہیئے۔ اور جو کچھ پڑھایا جاوے وہ اس طرح پڑھایا جائے کہ طالب علم اُس کو سمجھ سکیں اور ان کو یہ بات

محسوس ہو کہ ہم کو ایسی باتیں معلوم ہوگئیں جو پہلے معلوم نہ تھیں۔

(۳) یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ رٹنے سے یہ ضروری نہیں کہ حافظہ کو ترقی ہو۔

(۴) بچوں کو بہت سادہ طریقہ سے سمجھاؤ۔ پہلے ایک آسان سی بات اُنھیں بتاؤ اور دیکھو کہ وہ اس کو سمجھتے ہیں یا نہیں اور اس کے بعد رفتہ رفتہ دقیق باتیں بتائی جائیں۔ اوّل آسان باتوں سے شروع کرنا چاہیئے۔

(۵) آخر میں لاک بچوں کو دنیا کا صحیح اندازہ معلوم کرنے کے لئے سیاحت کو بھی شامل کرتا ہے اور اس کے نزدیک یہ بھی تعلیم کا جزو ہے۔

| مزدوروں اور اہل حرفہ کے مدارس (Working School) |
|---|

اگرچہ لاک کو زیادہ تر شرفا کی تعلیم ہی کے مسئلہ میں توغّل ہے تاہم ابتدائی تعلیم کے مسائل سے وہ اجنبی محض نہیں ہے۔ ۱۶۹۷ء میں اس نے انگریزی حکومت کے نام ایک قابل ذکر یادداشت لکھی جس میں غربا کے بچوں کے لئے (Working School) "پیشہ وروں کے مدارس" کے اجراء کی اہمیت دکھلائی۔ جس میں یہ بیان کیا کہ "تین سے چودہ برس تک کی عمر کے تمام غریب بچوں کو ایسے مکانات میں جمع کیا جائے جہاں اُن کو غذا ملے اور ان سے کام لیا جاوے۔" اس طریقہ سے بداخلاقی اور فاقہ زدگی کو دُور کرنے کا لاک نے اپنے خیال کے مطابق ایک ذریعہ پیدا کیا۔ گویا اس کے نزدیک اس ذریعہ سے غریب ماں کی فکروں کا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا جس کو اپنے کام سے سر اُٹھانے کی مہلت نہیں ملتی۔ اور اسی کے ساتھ ضابطہ اور ڈسپلن کی عادات کے سکھلانے سے توانا و تندرست اور محنتی اور پیشہ ور لوگ پیدا ہو سکیں گے۔ بالفاظ دیگر اس طریقہ سے اصلاح تمدن کی بنیاد ڈالی تھی۔ انگلستان میں اس وقت بھی لاک کے اصولوں پر یتیم بچوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق عمل کیا جاتا ہے اور ایک بہت وسیع اور عظیم الشان دارالیتامیٰ Bernaro کے نام سے ان ہی اصولوں پر کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔

# روسو

(۱۷۱۲-۱۷۷۸)

روسو کے متعلق مختلف نقطہ خیال کے لوگ بالکل متضاد خیال کا اظہار کرتے ہیں، اسکے سخت مخالف تو اس کو آوارہ مزاج ٹھیراتے اور کہتے ہیں کہ اُس نے کوئی نئی بات نہیں کہی۔ بلکہ بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ ان کتابوں کے مضامین کا سرقہ کیا ہے جن کو بظاہر وہ حقارت سے دیکھتا تھا۔ ان کے نزدیک وہ بہت خود پرست، مہمل اور یاوہ گو تھا۔ اور اکثر منافقانہ برتاؤ کرتا تھا مخالفین کہتے ہیں کہ اس ناپاک اور متمرد شخص کے مطابق تعلیم کا مطمح نظر ایک ایسا شریف وحشی پیدا کرنا تھا جو بروایت قصص بحر اوقیانوس کے کسی خوبصورت جزیرہ میں ہو[1]۔ برخلاف اس کے روسو کے پرجوش مداح اُن تمام اصلاحات کا بانی قرار دیتے ہیں جو گذشتہ صدی میں سیاسیات و مذہب اور تعلیمات میں واقع ہوئی ہیں۔ ان کے نزدیک ہمارے تمام صحیح سیاسی اصول، جمہوریت اور اصول انصاف کے متعلق ہمارے تمام خواہشات، درس و تدریس و تعلیم و تعلم کے متعلق ہمارے تمام کارنامے اور ہماری تمام مذہبی اصلاحات کا ماخذ روسو کی تحریرات ہیں کمپاری نے روسو کو اٹھارویں صدی کا سب سے بڑا مبصر تعلیم اور فرانسیسی فن معلمی کا بانی مبانی قرار دیا ہے۔

لیکن حقیقت حال یہ ہے ہر اس شخص کو جو فن تعلیم و تدریس کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ عام اس سے کہ اسکو روسو کی تحریرات سے عقیدت ہو یا نفرت یا وہ ان کے مطالعہ کا خواہشمند ہو یا نہ ہو روسو کی تصانیف کا مطالعہ لازمی ہے روسو کو انقلاب فرانس کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔ مگر وہ انقلاب کے وقت بذات خود زندہ نہ تھا آزاد تعلیم کی داغ بیل روسو نے ڈالی۔ اور لوتھر نے تعلیم عامہ کی اشاعت میں سعی کی۔ روسو کی پیدائش بمقام جنیوا ۱۷۱۲ء میں ہوئی اس کا باپ گھڑی سازی کا پیشہ کرتا تھا

[1] یہ ایک قصہ ہے جو کہ عام طور سے اکثر کتابوں میں درج ہے۔ کہ بحر اوقیانوس کے خوبصورت جزیرہ میں ایک حسین لڑکا بادشاہ ہوا کرتا تھا۔ جو نہایت سمجھدار اور فہیم تھا۔ اور اس جزیرہ کا تمام تمدن اسی جزیرہ کی فطری پیدائش میں تھا۔

اور اپنے نوجوان بیٹے کو ناول اور تاریخ کی بہت سی کتابیں اس غرض سے سنایا کرتا تھا کہ
اس کی قوت متخیلہ کو تیز کرے۔ ۱۶ سال کی عمر میں روسو گھر سے بھاگ گیا اور کئی سال آوارہ
گردی میں بسر کئے اور ہر قسم کی صحبتوں میں اپنی عمر صرف کی۔ ۱۷۴۹ء میں روسو کی علمی زندگی
کا آغاز اس طرح ہوا کہ اس نے ایک انعامی مضمون پر خامہ فرسائی کی، جس کا موضوع تھا کہ
"بنی نوع انسان کی راحت کے لئے سائنس اور تہذیب و تمدن کا کیا حصہ ہے" ڈیڈروٹ
Diderot نے اسے یہ مشورہ دیا کہ قبولیت عام حاصل کرنے کے لئے مخالفانہ روش
اختیار کرنا چاہیئے۔ یہ مشورہ روسو کی جبلت کے عین مطابق تھا۔ اس مضمون میں روسو نے یہ
ثابت کیا ہے کہ تہذیب و تمدن، علم و ہنر اور تمام انسانی انسٹی ٹیوشنز اول سے لے کر آخر
تک اپنے نتائج و اثرات کے لحاظ سے سخت مضرت رساں ہیں اور تا وقتیکہ ان سب کو قطعی
طور سے ترک نہ کر دیا جائے اور قدرتی حالت پھر نہ اختیار کی جائے بنی نوع انسان کو فلاح
و راحت نصیب نہیں ہو سکتی۔

۱۷۵۶ء میں وہ پیرس کو لوٹ آیا اور تعلیم کے بارے میں اپنا خاکہ تیار کرتا رہا۔ بالآخر
اس نے رجوع الی الفطرۃ کے اصول کو تعلیم میں آزادی کے ساتھ استعمال کیا اس کی نہایت
مشہور کتاب "ایمل" Emile کا پہلا فقرہ اس کے اصول تعلیم کی وضاحت کے لئے کافی
ہے یعنی "خلاق عالم کے پاس سے ہر چیز عمدہ حالت میں آتی ہے حضرت انسان کے ہاتھوں
ہر چیز کا ستیاناس ہوتا ہے" روسو نے عمل کرنے کے لئے یہ اصول قرار دیا ہے کہ "جو
کچھ عام طور سے لوگ کرتے ہیں تم ٹھیک اس کے مخالف کام کرو۔ ایسا کرنے سے غالباً
تم صحیح راستہ پر پہنچ جاؤ گے" اس نے عام مدارس کی تعلیم کا خوب مذاق اڑایا ہے اور
بلا شبہ اس تعلیم کی لغویت کو ثابت کر دکھایا، لیکن جب اس نے اس تعلیم کے بجائے جس کو
اس نے مٹایا تھا اپنے مسبط اصول قایم کئے تو وہاں وہ بالکل ناکامیاب رہا اور اس کا درجہ
شیخ چلی سے زیادہ نہ بڑھا۔ اس نے قدیم اعتقادات پر حملے کئے جس کی پاداش میں پارلیمینٹ

پیرس نے اس کی گرفتاری کے احکام جاری کئے اور مجبوراً اس کو پیرس چھوڑنا پڑا۔

۱۷۶۶ء میں ہیوم کے بلانے پر وہ انگلستان گیا لیکن اپنے دوستوں پر اس کو شبہ ہو گیا اور دوسرے سال وہاں سے واپس آگیا۔ ۱۷۷۰ء میں دوبارہ پیرس گیا اور ۱۷۷۸ء میں وفات پائی۔

روسو نے ایمل کے حالات بچپن سے لے کر اس وقت تک کے جب کہ وہ ایک بچہ کا باپ بن گیا اپنی کتاب میں جس کو اس نے اپنے فرضی شاگرد کے نام سے موسوم کیا ہے (یعنی کتاب کا نام بھی ایمل رکھا ہے) درج کئے ہیں۔

باب اوّل میں تعلیم کے اصول ہیں اور پہلے سال کی تعلیم کا حال ہے۔ دوسرے میں شیر خوارگی کی تعلیم کا تذکرہ ہے اور بعد کے ابواب لڑکپن اور نوجوانی سے متعلق ہیں۔ روسو پبلک اسکولوں کا قائل نہیں اور نہ والدین کی تربیت پر بھروسہ کرتا ہے، کیونکہ وہ اپنی اندھی محبت ولاڈ و پیار سے بچوں کو بگاڑ دیتے ہیں۔ اس نے اپنی کتاب میں ایمل کو ایک اتالیق کے سپرد کیا ہے جو اپنے شاگرد کو لے کر دیہات کے غیر معروف مقام پر چلا گیا۔ تاکہ سوسائٹی کے ضرر سے محفوظ رہے اور وہاں پچیس سال کی عمر تک ایمل اپنے اتالیق کے ہمراہ رہا۔ ۱۲ سال کی عمر تک ایمل کو کتاب کے وجود تک کا کوئی علم نہ دیا گیا۔ اس کی کتاب صحیفۂ قدرت کا نہ کہ الفاظ کی کتابیں۔ ۱۸ سال کی عمر میں اپنے اتالیق کے ساتھ ایمل پیرس جاتا ہے اور ایک سال تک وہاں رہتا ہے۔ اس کا اتالیق اس کے لئے زوجہ کا انتخاب کرتا ہے اور جب تک کہ ایمل نے باپ بننے کا رتبہ حاصل نہیں کر لیا وہ اسی کے ساتھ رہا۔ ہم کو ایمل قصے، کہانی کی کتابوں کا ہیرو معلوم ہوتا ہے نہ ایک واقعی سچ مچ کا انسان۔

## تعلیم کے اصول

روسو نے تعلیم کے جو اصول قرار دیے ہیں وہ اکثر صحیح نہیں ہیں اور جہاں تک ممکن ہوگا

میں اسی کے الفاظ میں اُن کو درج کرنا چاہتا ہوں۔

(الف) روسو نہایت زور کے ساتھ دایہ رکھنے کی مخالفت کرتا ہے۔ وہ ماؤں سے خطاب کرکے کہتا ہے کہ "اپنے بچے کی تندرستی کے خیال سے اور اپنے خاندان کے اخلاق اور صفات حسنہ کے لحاظ سے نیز اپنے گھر کی وقعت و حرمت قایم رکھنے کے لئے تم یہ مادرانہ فرض بذات خود انجام دو اور ہرگز بچوں کے دودھ پلانے کے لئے دایہ مت رکھو"[1]

(ب) تعلیم تو اسے دماغی کی ترقی کے لئے ہے اور اس لئے بغیر جبر و اکراہ و تحریص کے شاگرد کو پڑھانا چاہیئے اور پڑھنا بھی کھیل کی طرح سکھلانا چاہیئے۔

(ج) چلنے پھرنے میں بچوں کو خوب آزادی دو۔ کسی بات کی خود عادت مت ڈالو اور کھانے پینے کے لئے کوئی وقت مقرر مت کرو اُن میں صرف یہی ایک عادت ہونی چاہیے کہ عادت کوئی نہ ہو۔

(اس اصول میں زمانہ موجودہ کے مبصرین تعلیم روسو کے موئد نہیں ہیں جس کی تفصیل آیندہ آئے گی)

(د) تعلیم کے متعلق سب سے زیادہ اہم اور کارآمد اصول یہ ہے کہ وقت کے متعلق یہ فکر نہو کہ تھوڑے سے زمانے میں سب کچھ ہو جاے۔ وقت کو تعلیم میں زیادہ صرف کرنا بمقابلہ وقت بچانے کے زیادہ اچھا ہے۔ بلکہ کان کنی کی طرح تعلیم میں بھی اگلا قدم اُس وقت اُٹھایا جاے جب کہ ایک ایک انچہ زمین خوب اچھی طرح تیار ہو جاے۔

(بدقسمتی سے آج کل کے مدارس میں اس اصول کو نظرانداز کیا جاتا ہے۔ طرز جدید

---

[1] جن صاحبوں نے اپنے بچوں کے دودھ پلانے کے لئے دائیں مقرر کی ہیں ان کا تجربہ بتلاتا ہے کہ ان کے وہ بچے جنھوں نے دایہ کا دودھ پیا ہے بہ نسبت اُن بچوں کے جنھوں نے اپنی ماؤں کا دودھ پیا ہے کم عقل ہوتے ہیں اور اُن میں خاندانی خصوصیات بھی کم ہوتی ہیں۔

کے تعلیم یافتہ لوگوں کے مقابلے میں طرز قدیم کے تعلیم پائے ہوئے لوگوں کی بدیہی برتری کا راز اسی میں مضمر ہے کہ اس اصول کی طرز قدیم میں پوری پوری پابندی کی جاتی تھی اور یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانہ کے تعلیم یافتہ زیادہ ٹھوس اور زمانہ حال کے تعلیم یافتہ سطحی ہیں)

(۵) برخلاف ملٹن کے روسو نہیں چاہتا کہ طالب علم ہر رطب و یابس کا علم حاصل کرے اور علم کے اعتبار سے عمرو عیار کی زنبیل ہو جائے، بلکہ طلبہ کو منتخب چیزیں سیکھنا چاہئیں۔ میں روسو کے الفاظ یہاں نقل کرتا ہوں۔

"میں جب ایسے شخص کو دیکھتا ہوں جو علم کی دل آویزی سے متاثر ہو کر علم کی ایک شاخ سے دوسری شاخ کی طرف دوڑتا ہے اور نہیں جانتا کہ کس مقام پر دم لے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ اُس کی مثال اُس نادان بچے کی سی ہے جو سمندر کے کنارے سیپ جمع کر رہا ہو اور دامن بھر کر لے جانے والا ہو کہ اُس کی نگاہ دوسرے زیادہ چمکدار سیپوں پر پڑے اور وہ اُن کو پھینک کر دوسروں کو اُٹھالے اور آخر کار اس سے تنگ آکر کہ کس کو لے اور کس کو نہ لے وہ سب کو چھوڑ چھاڑ خالی ہاتھ گھر کو لوٹ آئے"

یہ مثال اُن لوگوں کے بالکل حسب حال ہے جو بلا سوچے سمجھے ایک زندہ انسائیکلوپیڈیا بننے کے آرزومند ہیں یا جن پر "چارپائے بر و کتابے چند" کی مثل صادق آتی ہے۔

(و) روسو کی سب سے بڑی خدمات میں سے ایک یہ ہے کہ اُس نے اس بات پر نہایت زور دیا ہے کہ بچوں کو پڑھاتے وقت اس کا ضرور خیال رہے کہ وہ بچے ہیں بڑے آدمی نہیں ہیں یعنی بچوں کو بچوں کے طریقے سے پڑھانا چاہئے نہ کہ بڑے آدمیوں کے طریقے سے۔

بچوں کے لئے کسی بات کو دیکھنے، سوچنے اور محسوس کرنے کا طریقہ اُن کی عمر کے مطابق ہو۔ اس سے زیادہ لغو اور کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ ہم اپنے طریقوں کو اس کا قائم مقام کریں۔ اگر ہم ان کے دماغوں میں اپنے خیالات سقراطی طریق استدلال سے ٹھوسیں تو گویا ہم اُن کے دماغوں میں ایسی بات ڈالتے ہیں جو اُن کی استطاعت سے باہر ہے۔

(ز) روسو اس بات کے بھی خلاف ہے کہ بچے کو ہر وقت وعظ و پند کیا جائے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر تم ہر وقت بچوں کو نصیحت کرتے رہو تو اُن کو مخبوط الحواس کر دو گے۔ اگر تم ہر وقت ان کو ٹک ٹک کرتے رہے اور یہ کہتے رہے کہ "یہاں آؤ، وہاں جاؤ، ٹھیرو۔ یہ کرو۔ وہ مت کرو" اگر تمہارا دماغ اس کے اعضاء کو حرکت دیتا رہا تو خود اس کا دماغ معطل ہو جائے گا۔

ایسا بچہ اپنی ذات پر کبھی بھروسہ نہ کر سکے گا۔ بلکہ وہ ہمیشہ سہارے کا محتاج رہیگا اور اس میں کبھی ضبط نفس اور اپنے اوپر کبھی بھروسہ کا مادّہ نہ ہو گا۔ جو لوگ سختی سے سخت ڈسپلن کے طرف دار ہیں اُن کو اس رائے پر خاص توجہ کرنا چاہیئے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب لڑکے خود مختار ہوتے ہیں تو وہ پکے بدمعاش اور آوارہ گرد ہو جاتے ہیں[1]

[1] اس موقع پر میں بہت سی مثالیں اپنے کالج اور اور درس گاہوں کی پیش کر سکتا ہوں جس سے معلوم ہو جائے گا کہ جب کم سمجھ طالب علم ایک سخت ڈسپلن سے نرم ڈسپلن کی طرف عود کرتے ہیں تو وہ عموماً خراب ہو جاتے ہیں بشرطیکہ اُن پر اس تبدیلی زمانہ میں خاص طور پر ایک خاص نگرانی نہ کی جائے اور ان کو رفتہ رفتہ اس نرم ڈسپلن کا عادی نہ بنایا جائے۔

روسو بچوں کی ہر وقت دیکھ بھال کا طرف دار نہیں۔ جیسا کہ فرانس کے پبلک اسکولوں میں موجودہ دستور ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کھیل کے میدان میں جو سبق بچے ایکدوسرے سے حاصل کرتے ہیں وہ بدرجہا مفید و کارآمد ہیں۔ بہ نسبت اُن سبقوں کے جو اُن کو اسکولوں میں پڑھائے جاتے ہیں۔

(روسو کے اس مشورہ پر صرف انگریزی قوم نے عمل کیا اور اُن کے کیرکٹر کی خصلت کا یہی راز ہے۔ فرانس کے اسکولوں کی موجودہ ڈسپلن نپولین بوناپارٹ کے اصولوں پر مبنی ہیں۔ فرانس میں ایک قانون ہے کہ اگر کسی بچے کو زمانہ تعلیم میں کوئی صدمہ پہنچے تو والدین چارہ جوئی کر سکتے ہیں اور اُستادوں کو تلافی کرنا پڑتی ہے اور اس لئے اُستاد بھی ہر وقت طالب علم کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں کہ اِس کو صدمہ نہ پہنچ جائے)

(ح) کسی بات کے کرنے یا نہ کرنے کا انحصار بچے کے ذاتی تجربہ پر ہونا چاہیئے۔ اگر بچہ ایسی چیز لینے کی خواہش کرے جو اُس کے حق میں اچھی نہ ہو، تو ہم کو اُسے باز رکھنے کے لئے تحکمانہ طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ برخلاف اس کے جسمانی موانعات اس کے خلاف پیدا کرنے چاہئیں مثلاً کوئی چیز ایسی جگہہ رکھدینا جو بچے کی پہنچ اور دسترس سے باہر ہو، یا اگر کوئی کھانے کی چیز ہو تو اس کا ذایقہ خراب کر دینا، اس طرح بچے میں اپنے افعال کی ذمہ داری محسوس کرنے کا مادہ پیدا ہوگا۔ روسو لکھتا ہے کہ ہم کو یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ بچہ اخلاقی پند و نصایح کے بجائے اُن امور کو محسوس کرتا ہے جو جسمانی حالت پر موثر ہوتی ہیں۔

(میں سمجھتا ہوں کہ روسو کے مشورہ کو چند ترمیمات کے ساتھ قبول کرنا چاہیئے میری رائے میں اطاعت اور فرماں برداری کے جذبات و خیالات بہت چھوٹی عمر میں پیدا کرتے چاہئیں۔ اور میں نہیں خیال کر سکتا کہ بچہ اُن اخلاقی باتوں سے

بالکل بے بہرہ ہوتا ہے جس کو روسو نے اخلاقیات سے تعبیر کیا ہے گردو پیش کے اثرات کا کوئی مضر اثر نہ پڑا ہو تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ حکم ماننے میں بچوں کو طبعی خوشی ہوتی ہے)

**پیشہ و کاروبار کی تعلیم**

لاک کی طرح روسو بھی اپنے شاگردوں کو کسی کاروبار و تجارت کی تعلیم حاصل کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ لاک کا مشورہ تو اس خیال پر مبنی ہے کہ قوائے عملی کی تربیت اور قوت مشاہدہ کو ترقی ہو سکے لیکن روسو اس قسم کی تعلیم کے حصول کو اس لئے تجویز کرتا ہے کہ خدانخواستہ اگر انقلاب زمانہ کی وجہ سے کوئی برا وقت آپڑے اور مال و دولت ضایع ہو جائے تو اپنے ہنر کی بدولت اُسے دستبرد زمانہ سے پناہ مل سکے۔ روسو لکھتا ہے کہ" ہم ایک ایسے زمانہ کے قریب پہنچ رہے ہیں جس میں انقلابات دہر عرصہ دراز سے وقوع پذیر ہیں، اور کسی کو نہیں معلوم ہے کہ کل کیا اُفتاد پڑے گی"۔

**مذہبی تعلیم**

روسو مذہبی تعلیم کی اہمیت و ضرورت کو پورے طور سے محسوس کرنے میں قطعًا ناکام رہے وہ اٹھارہ سال کی عمر سے قبل مذہب کی تعلیم دینے کے خلاف ہے۔ کیونکہ اُس کا قول ہے کہ بچّہ اپنی قوت متخیلہ کی وجہ سے لازمی طور پر موجودات عالم کا پرستار ہوتا ہے اور جب اُس سے خدائے تعالیٰ کی ہستی کا تذکرہ کیا جائے تو وہ اُس ذات اقدس کے متعلق جو خیال قایم کرے گا وہ حقیقت سے دور بالکل توہم پرستانہ ہوگا اور جب ایک مرتبہ توہم پرستی کی جڑ قائم ہو گئی تو پھر اُس کا مٹنا محال ہے۔ خود مذہب کے حق میں یہ مفید ہوگا کہ اس کی تعلیم کو اس وقت تک ملتوی کریں جب تک کہ بچّہ کی سمجھ پختہ نہ ہو جائے اور سوچنے کی قوت اس قدر حاصل نہ ہو جائے کہ وہ باری تعالیٰ کے عقیدہ کو راسخ کر سکے۔ مذہبی تعلیم کے بارے میں روسو کے مندرجہ بالا خیالات کے متعلق دو مشکلات ہیں۔

۱۔ بچّوں میں دریافت حال کا جو مادّہ قدرتی طور پر ہوتا ہے اس کا لحاظ کرتے ہوئے کیا یہ ممکن ہے کہ اٹھارہ سال تک بچّہ عالم موجودات عالم کے اسباب وعلل کی بابت بے خبر رہے اور کسی امر کے متعلق سوال کرنے کا خیال اُس کے دل میں پیدا نہ ہو۔

۲۔ یہ بھی خوف ہے کہ جس بچّے کو ۱۸ سال کی عمر تک خدا کی ہستی کے علم سے بالکل ناواقف رکھا جائے تو قدرتی طور سے وہ اُس کے بعد بھی ناواقف رہنا پسند کرے گا۔ وہ اپنے اُستاد سے کبھی کبھی اس کے بارے میں بحث ومباحثہ کرے گا اور بجائے یقین کے شکوک وشبہات کا شکار رہے گا۔

تاریخ بھی اس بات کی شاہد ہے کہ مذہبی تعلیم کے بارہ میں رُوسو کے خیالات صحت پر مبنی نہیں تھے۔ ایک جرمن فلسفی سنٹینس Sentenis نامی اپنے حالات میں لکھتا ہے کہ میرے باپ نے روسو کے مشورہ کے مطابق اس طریق تعلیم وتربیت کا مجھ کو تختۂ مشق بنایا، جو رُوسو نے ایمل کی تعلیم وتربیت کے بارہ میں دیا ہے۔ مجھے ایک گمنام مقام پر رکھا گیا اور اس کی اجازت نہیں دی گئی کہ میں دوسرے لوگوں سے کوئی تعلق یا واسطہ پیدا کروں۔ میرے ذہن وعقل کی پرداخت موجودات عالم کے مشاہدے سے کی گئی۔ دس سال کی عمر تک میں کتاب کی صورت تک بھی دیکھنے نہ پایا اور خدا کا نام مجھ سے پوشیدہ رکھا گیا تھا۔ مگر میرے دل ودماغ نے اپنی بساط کے مطابق اس کو حاصل کیا میرے باپ پر یہ ظاہر ہو گیا کہ اس بچے نے یہ عادت ڈال لی ہے کہ صبح سویرے اٹھ کر باغ میں جاتا اور سورج کی پرستش کرتا ہے، جس کو اُس نے اپنا معبود قرار دے لیا ہے تو اُس کو بہت تعجب ہوا۔ اور والد نے جب مجھے یہ بتلایا کہ ہر ایک ستارہ سورج سے بڑا ہے تو مجھکو بہت رنج ہوا۔ مگر یہ حالت دیکھکر والد سے رہا نہ گیا اور اُنھوں نے خالق کون ومکان کی ہستی کا مجھ سے اقرار کیا۔

(حضرت ابراہیم خلیل اللہ علی نبینا علیہ السلام کے بچپن کے مشہور واقعہ سے بھی
رؔوسو کے اصول کی جو اُس نے مذہبی تعلیم کے متعلق قرار دیے ہیں تردید
ہوتی ہے)

**تعلیم اناث**

دوسری غلطی روسو نے تعلیم اناث کے متعلق رائے دینے میں کی ہے وہ لکھتا ہے کہ:-

"عورتوں کی تعلیم و تربیت تمام تر مردوں کی ضروریات کے اعتبار سے ہونا چاہیے ہر زمانہ و قرن میں عورتوں کے فرائض بس یہی ہوتے ہیں کہ مردوں کو خوش و خرّم رکھنا، اُن کی اطاعت و خدمت کرنا اور اپنے برتاؤ سے مردوں کی نظر میں محبوب و معزز بننا بچوں کی پرورش اور بڑوں کی خبرگیری رکھنا، مردوں کو صلاح و مشورہ دینا، رنج و مصیبت میں تسکین خاطر کرنا اور اُن کی زندگی خوشگوار اور مسرّت افزا بنانا۔ شوہروں کا فرض ہے کہ اپنی مونس زندگی کی معلومات بڑھائیں اور اپنے ذاتی خیالات کے مطابق اُن کو اپنے آرام و آسایش کے لئے اپنے سانچے میں ڈھال لیں"!

(ان خیالات کے اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ روسو تعلیم اناث کے بارہ میں
بعینہ وہی خیالات ظاہر کر رہا ہے جو انیسویں صدی کا کوئی ہندوستانی اپنی
لڑکی کے تعلیم و تربیت کے بارہ میں ظاہر کرے)

تعلیم کے باب میں رؔوسو نے جو رائے عام طور سے ظاہر کی ہے اس کے لحاظ سے میں ذیل میں ایک ایسا نصاب تعلیم مرتب کر کے پیش کروں گا جو اُس کے مشورہ سے مطابق ہو۔

بچے کی ابتدائی پرورش جو اُس کی ماں کے ذمہ ہے، جو اس کے حواس خمسہ کی پرداخت کرتی ہے، بچے کو سردی و گرمی کا عادی بنایا جاتا ہے اور اس کا خیال رکھا جاتا ہے کہ بچہ اپنی طبیعت میں کسی قسم کی عادتیں نہ ڈالے۔ جب بچے کی عمر چھ سال کی

ہو جاے تو اُس کو کسی ایسے اتالیق کے سپرد کیا جاے جو اُس کو کسی دیہاتی مقام پر لے جاکر اپنی نگرانی میں رکھے۔ بارہ سال کی عمر تک اس کی تعلیم منفی ہونا چاہیئے یعنی سوسائٹی اور گردو پیش کے مضر اثرات سے اس کو محفوظ و مصئون رکھا جاے۔ سواے صحیفۂ فطرت کے اور کسی کتاب کا مطالعہ وہ کرنے نہ پاے۔ ان ایّام میں سواے موسیقی اور نقاشی کے اس کو اور کچھہ نہیں سکھلانا چاہیئے۔ نقاشی بھی بطور فن و ہنر کے نہ ہو بلکہ اس غرض سے سکھلائی جاے کہ نظر میں بصیرت اور ہاتھوں میں چابک دستی کا مادّہ پیدا ہو اور وہ قدرتی مناظر اور مشاہدہ اشیا سے نقشے اور چربے اُتار سکے تصاویر کی نقالی نہ کرے۔ بارہویں سال سے اس کی کتابی تعلیم کا زمانہ شروع ہو۔ اس وقت اس کو صرف ایک ہی زبان سکھلائی جاے اور سواے رابن سن کروسو Robinson Crusoe کے اور کوئی کتاب اُسکے پاس نہ ہو۔ اس معمولی طریقے سے سائنس کی تعلیم، ریاضی و طبعیات شروع کرانی چاہیئے کتاب سے نہیں پڑھانا چاہیئے بلکہ ہر اصول کو طلبہ سے ایک جدّت کی صورت میں نکلوانے چاہیئں اور جامیٹری پڑھانی نہیں چاہیے بلکہ اُقلیدس کی شکلیں لڑکے سے اس طریقے سے اختراع کرانی چاہیئں گویا وہ خود اُس کا موجد ہے۔ اس کے بعد ہیئت و جغرافیہ بھی پڑھے۔ جغرافیہ کا علم کسی کتاب سے حاصل نہ کرے بلکہ چل پھر کر ہر ایک چیز کا مشاہدہ کرا کر بتایا جاے۔ پندرہویں سال وہ نجاری یا کوئی اور پیشہ سیکھے اور فن تاریخ کا مطالعہ شروع کرایا جاوے۔ اور علم تاریخ کو لوگوں کی سوانح عمری کی صورت پڑھانا چاہیئے۔ رُوسو اور پلوٹارک کی تاریخ بھی پڑھائی جاسکتی ہے وہ بہترین کتاب قرار دی گئی ہے۔ مذہبی تعلیم ۱۸ سال کی عمر میں شروع ہونی چاہیئے اور روسو کے نزدیک مذہبی تعلیم شروع ہونے پر شاگرد اخلاق کا ماہر بن جاتا ہے۔ ۲۰ سال کی عمر میں وہ اپنے اتالیق کے معیت میں پیرس جاے اور اگرچہ اس نے مطالعہ کچھہ زیادہ نہیں کیا لیکن وہ اس قابل سمجھا جاے گا کہ گویا باقاعدہ تعلیم حاصل کر سکے۔ بائیسویں سال میں اُس کی شادی ہونی چاہیئے اور دُلھن کا انتخاب اُس کا اتالیق

خود کرے اور دو سال تک میاں بی بی سیر و سیاحت میں گزاریں۔ پچیسویں سال جب شاگرد رشید خیر سے بچے کا باپ بن جائے تو اتالیق صاحب رخصت ہو جائیں۔

اس پروگرام میں علاوہ اور نقائص کے ایک نقص یہ بھی ہے کہ ہر لڑکے کے لئے ایک اُستاد کی ضرورت ہے۔ ۲۵ برس تک نوجوان کو تعلیم دینے کے لئے فرداً فرداً ایک اتالیق کو اپنا حصّہ زندگی وقف کر دینا چاہیئے جس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم فرض کر لیں کہ اوسط عمر کی ۷۵ برس کی ہے تو اس میں سے ہر ایک شخص کی عمر کا ۲۵ برس کا زمانہ تو تعلیم حاصل کرنے اور پچیس برس دوسرے کو تعلیم دینے کے لئے درکار ہوگا، کیونکہ روسو کی تجویز کے مطابق اگر ہر شخص تعلیم حاصل کرنا چاہے تو ہر شخص کو معلم بننا پڑے گا اور اس طرح ۷۵ برس میں سے صرف ۲۵ برس مجموعی طور سے کسبِ معیشت اور فرائض زندگی کے لئے صرف ہوں گے۔ اس طریقے سے ⅔ سے زیادہ تیاری میں صرف ہوگا اور ⅓ سے کم حصول مدعا میں۔

## PESTALOZZI

# پستالوزی

### ۱۷۴۶ء لغایت ۱۸۲۷ء

پستالوزی ۱۷۴۶ء میں بمقام زیورک Zurich پیدا ہوا۔ اس کا باپ جراحی کرتا تھا اور ایک باعزت آدمی تھا۔ پستالوزی کی تربیت اس کی ماں نے کی یہی وجہ ہے کہ وہ روسو کی رائے کے برخلاف تعلیم کے باب میں ماں کے اثر کا سخت قائل تھا۔ پستالوزی نے علم دین کی تحصیل اپنے دادا کی ترغیب و تحریص سے کی لیکن جب اس کو اوّل وعظ میں ناکامی ہوئی تو وہ دینیات کو چھوڑ کر قانون کی تحصیل میں مصروف ہو گیا۔ آخر کار اُس نے فن زراعت سیکھا اور خود ہی اپنا مزرعہ Neuhof تیار کیا۔ مگر اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ پستالوزی کاروباری آدمی نہ تھا اور اس کا حساب و کتاب رکھنے کا طریقہ

عمدہ نہ تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس کا دوالہ نکل گیا۔ مگر اُس کے دوست دستگیر ہوگئے اور اُسے بالکل تباہ ہوجانے سے بچا لیا۔ نیوہوف کے ہفت سالہ قیام میں پستالوزی کو معلوم ہوگیا کہ وہ کاروبار کے سراسر ناقابل ہے۔ لیکن اُسے یہ بھی معلوم ہونے لگا کہ اُس کی جگہ عالم فکر و خیال بھی ہے تعلیمات میں جو انکشافات اُسے ہوئے ان کی ابتدا اُن مشاہدات اور تجربات سے ہوئی جو اُس نے اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت میں کئے اور جنھیں وہ باقاعدہ طور پر اُس کتاب میں درج کرتا رہا جو "ایک باپ کے روزنامچہ" کے نام سے بعد میں شائع ہوئی۔

پستالوزی کے زمانہ میں ابتدائی تعلیم کی حالت سوئٹزرلینڈ میں بھی ایسی ہی ابتر تھی جیسی کہ آج ہندوستان میں ہے معلموں کے انتخاب کا کوئی طریقہ نہ تھا۔ انھیں نہایت ذلیل اور قلیل مشاہرے ملتے تھے اور بیشتر اوقات ان کے پاس رہنے کے لئے اپنا گھر بھی نہیں ہوتا تھا۔ پس وہ بمجبوری خوش حال دیہاتیوں کی نوکری کر لیتے تھے پستالوزی نے کسی معلم کے تقرر کا ایک بہت دلچسپ قصہ بیان کیا جس کا ماحصل یہ ہے کہ سوئٹزرلینڈ میں ایک مرتبہ ایک حاکم مال راستہ پر جا رہا تھا۔ گلی میں ایک پھیری والے کا مزدور ملا اور یہ اُس سے باتیں کرنے لگا حکم نے کہا۔

"کیا تمہیں خبر ہے کہ فلاں مدرسہ کا معلّم نوکری چھوڑنے کو ہے۔ کیا تم اُس کی جگہ لینا چاہتے ہو"؟

"جناب میرے چاہنے نہ چاہنے کا کیا سوال ہے میں تو وہ علم رکھتا ہی نہیں جو ایک معلّم کے لئے درکار ہے"

"مگر وہ تو تم اب بھی بسہولت سیکھ سکتے ہو"

مزدور ذرا دیر سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اُس نے کسی کا خط سامنے رکھ کر سو سطریں نقل کر ڈالیں بس یہی اُس کی ساری تیاری تھی اور اسی کے ساتھ وہ فہرست امیدواران میں

داخل ہو گیا اور کمیٹی نے اُسے بہترین امیدوار قرار دے کر منتخب کر لیا!!!

پستالوزی Pestalozzi کو روسو Rausseou پر جو بہت بڑی فوقیت حاصل ہے وہ یہ ہے کہ وہ اصول تعلیم جو روسو نے فقط اہل دول کے لئے مخصوص کر دیے تھے پستالوزی نے جمہور کے لئے عام کر دیے اور بے شمار بچّوں کو ان کے مطابق تعلیم دلوائی۔

جو حالت آج ہمارے ملک میں ہے وہی پستالوزی کے زمانہ میں تھی یعنی تعلیم کا مقصد یہ سمجھا جاتا ہے کہ مزدوری پیشہ آدمیوں کو منشی گری سکھا دی جائے۔ روسو نے دنیا کو اس غلط خیال سے نجات دے دی تھی کہ تعلیم کے معنی ہیں کتاب پڑھ لینے کے۔ پستالوزی نے کہا کہ تعلیم ایسی چیز ہونی چاہیئے جو غربا کے حال کی اصلاح کرے اور یہ بات فقط نوشت و خواند سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ بچوں کو یہ تعلیم ملنی چاہیئے کہ نہ فقط بڑوں کی عزت کریں بلکہ خود اپنی عزت آپ کرنا سیکھیں اور اپنی مدد آپ کر سکیں۔ خودداری اور اعتماد علی النفس کے اوصاف بھی اُن میں پیدا ہو جائیں۔ پستالوزی کا مقولہ ہے کہ تعلیم میں اس فروگزاشت کی تلافی بھی ہونا چاہیئے جو والدین سے ہوتی ہے۔ فقط نوشت و خواند اور حساب کتاب جان لینا ہی بالآخر سب سے زیادہ ضروری چیز انسان کے لئے نہیں ان میں سے جو کچھ بھی انسان سیکھ لے مفید ہے لیکن سب سے زیادہ ضروری چیز بچّوں کی تعلیم میں یہ ہے کہ اُن کو کسی کام کا بنا دو۔ تب وہ وقت آئے گا کہ ہم کو قومی تعلیم کی کچھ اُمید کرنا چاہیئے۔ جب یہ حقیقت اور تعلیم کی یہ غایت اساتذہ اور منتظمین مدارس کے دلوں پر پورے طور سے منکشف ہو جائے اس اصول کی تلقین آج اہل ہندوستان کو بھی اسی شدومد کے ساتھ ضروری ہے جیسی پستالوزی نے آج سے سوا سو برس پہلے اہل سوئٹزرلینڈ کو دی تھی۔

پستالوزی کی زندگی میں اس کے ہم وطن اس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اہل فرانس نے جو اس زمانہ میں سوئٹزرلینڈ پر قابض تھے، اس کو وقعت کی نگاہ سے نہ دیکھا

مگر اہل جرمنی نے اس کی بڑی توقیر کی منزلت کی اور اس کے اصول کو قبول کر لیا۔ جن کے مفید نتیجے دیکھنے کے بعد پستالوزی کے ہم وطنوں نے اس کی قدر کرنا شروع کی۔ چنانچہ وہ خود لکھتا ہے کہ: "میرے کام کے راستہ میں جو مشکلات ہیں وہ بہت ہی بڑی ہیں۔ جمہور کی رائے سراسر میرے خلاف ہے۔ ہزار ہا اشخاص ایسے ہیں جو میرے کام کو لہو و لعب سمجھتے ہیں اور جو لوگ اپنے تئیں اہل الرائے تصور کرتے ہیں وہ تو سب کے سب ہی اسے مہمل جانتے ہیں، اور ان میں سے بعض تو ایسے ہیں جو اسے ایک مجہول اور نامعقول حرکت سمجھتے ہیں۔"

جب ایک وفد سوئٹزرلینڈ سے نپولین بوناپارٹ کے دربار میں اس سوال پر گفتگو کرنے کے لئے گیا کہ سوئٹزرلینڈ کا مستقبل کیا ہوگا۔ تو پستالوزی بھی اس وفد کے ساتھ گیا نپولین نے پستالوزی کو بار دینے سے انکار کر دیا اور حقارت کے ساتھ بولا کہ "میں الف ب۔ ت کے قصوں سے پریشان ہونا نہیں چاہتا۔" مگر دولت پروشیا (جرمنی) نے جسے نپولین نے جنگ جینیا (۱۸۰۶ء) میں مار مار کر خاک میں ملا دیا تھا۔ صاف صاف سمجھ چکا تھا کہ ہماری آئندہ بقا کا دارومدار قوم کی تعلیم پر ہے۔ شاہ پروشیا نے کہا:۔

"ہمارے علاقے ہمارے ہاتھ سے نکل گئے ہیں، ہماری سلطنت ضعیف ہو گئی ہے اور ممالک غیر میں ہماری ساکھ گھٹ گئی ہے اور اب ان از دست رفتہ چیزوں کے پھر حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے اہل ملک کی تعلیم و تربیت کا انتظام کریں۔"

سلطنت پروشیا کی عنان وزارت اس وقت حکیم فشتی (فیلسوف) کے ہاتھ میں تھی اور اسی نے یہ پالیسی قرار دی تھی۔ حکیم فشتی کا قول ہے کہ:۔

"میرے نزدیک جرمن قوم کا عروج و ترقی پستالوزی کی درس گاہ میں مخفی ہے"

حکومت پروشیا نے سترہ نوجوان کو پستالوزی کے مدرسہ میں تین سال کی تعلیم کے لئے بھیجا اور فروبل Froebel انھی میں تھا۔ ریٹر Ritter جو انھی سترہ لڑکوں میں سے ایک تھا لکھتا ہے کہ میں نے فردوس سوئٹزرلینڈ سے کچھ زیادہ دیکھا۔ کیونکہ میں نے پستالوزی کی بھی زیارت کی ہے اور میں جانتا ہوں کہ وہ کتنا بڑا دل اور کتنا بڑا دماغ رکھتا ہے"

سنہ ۱۷۷۴ء میں پستالوزی نے روئی کاتنے کا کارخانہ کھولا، یہ سمجھ کر کہ اس کی بدولت مالی مشکلات ختم ہو جائیں گی۔ مگر پستالوزی کاروبار کرنا نہیں جانتا تھا۔ کارخانہ ٹوٹ گیا اور سخت خسارہ ہوا۔ مقام نیوہوف Neuhof میں پستالوزی نے صنعت و حرفت کا ایک مدرسہ اپنے خرچ سے کھولا۔ اور جب اُس کا کاروبار بگڑا تو یہ مدرسہ چند سال تک چندے سے چلتا رہا۔ سنہ ۱۷۸۰ء میں یہ مدرسہ بھی بیٹھ گیا اور پستالوزی اور اُس کے اہل و عیال کی فلاکت اُن نادار لوگوں سے بھی بڑھ گئی، جن کی حالت سنوارنے کے واسطے یہ مدرسہ کھولا تھا۔

اب پستالوزی نے تصنیف و تالیف کا آغاز کیا اور اپنی مشہور و معروف کتاب "لونارڈ اینڈ گرٹروڈ" Leonard and Gertrude لکھی اس زمانہ میں اس نے اہل دیہات کی زندگی اور اُن کے مصائب کا نقشہ کھینچا ہے اور اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں کہ کیونکر خانگی اور مکتبی تعلیم کے ذریعہ سے اصلاح حال ممکن ہے۔

سنہ ۱۷۹۸ء میں پستالوزی سے درخواست کی گئی کہ وہ شہر اسٹانز Stanz میں ایک یتیم خانہ کی نگرانی اپنے ہاتھ میں لے لے۔ یہاں اُس نے اپنے خیالات کو

تجربہ کی کسوٹی پر کسا۔ نہ اُس نے کتابوں سے کام لیا اور نہ کوئی نصاب تعلیم اور انضباط اوقات بنانا۔ یہ یتیم خانہ بدیں وجہ بند ہو گیا کہ اُس کی عمارت گورنمنٹ فرانس نے فوجی شفا خانہ کے لئے لے لی۔

سنہ ۱۷۹۹ء میں پستالوزی برگ ڈورف Burgdorf میں اسسٹنٹ ماسٹر مقرر ہو گیا۔ یہیں وہ فشر سے ملا۔ سنہ ۱۸۰۰ء میں فشر کی وفات پر برگ ڈورف کا قلعہ پستالوزی کو دے دیا گیا۔ پستالوزی نے تجویز کیا کہ وہاں ایک مدرسہ تعلیم المعلمین کا ایک سکونتی سکنڈری اسکول، ایک ابتدائی اسکول اور ایک یتیم خانہ کھولے۔ اب برگ ڈورف تعلیمی تجربات اور تعلیم المعلمین کا ایک مرکز بن گیا کہ دنیا نے اب تک اُس کا نظیر نہیں دیکھا تھا۔

سنہ ۱۸۰۱ء میں پستالوزی نے اپنی یہ تصنیف شائع کی "گرٹ رو دکیونکر اپنے بچوں کو تعلیم دیتی ہے" How Gertrude teaches her children اور اس میں پستالوزی نے اپنے اصول و طریقہ ہائے تعلیم ایسے سیدھے سادھے لفظوں میں بیان کئے کہ ہر ماں انھیں سمجھ سکتی ہے اور ان پر عمل کر سکتی ہے۔ سنہ ۱۸۰۴ء میں پستالوزی کو یہ قلعہ چھوڑنا پڑا اس لئے کہ وہ سرکاری دفتر کے لئے درکار تھا۔ سنہ ۱۸۰۵ء میں وہ یردون Yverdun چلا آیا اور سنہ ۱۸۲۵ء تک یہیں رہا۔ بعد ازاں وہ اپنے مزرعہ Neuhof کو چلا گیا اور دو سال بعد سنہ ۱۸۲۷ء میں وہیں وفات پائی۔

پستالوزی کے حساب رکھنے کا طریقے جس کو عدم طریقہ یا بے ڈھنگے پن سے موسوم کرنا زیادہ مناسب ہے، اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اُس کے مدرسہ میں کسی معلم کو مشاہرہ نہیں ملتا تھا۔ طالبعلموں سے جو روپیہ وصول ہوتا تھا وہ ایک صندوقچہ میں رکھا رہتا تھا۔ اور ہر معلم کے پاس اس صندوقچے کی ایک کنجی رہتی تھی، جب ضرورت ہوئی صندوقچہ کھولا اور جتنا روپیہ درکار ہوا نکال لیا۔ چاہے یہ ضرورت اُس کی ذاتی ہو یا مدرسہ کے متعلق۔ گویا یہ اُس عہد زریں کی طرف معاودت تھی جہاں ہر شخص کی دیانت و امانت

فرشتوں جیسی ہو، اور جس میں اس کل جگ کے زمانہ میں عمل نہیں ہو سکتا۔

برگ ڈورف کی تعلیم گاہ میں نتو سے بھی کم بچے تھے اور انھیں بڑی آزادی تھی۔ نہ یہاں سزا ملتی تھی نہ انعام۔ ایک شخص نے اس تعلیم گاہ کو دیکھ کر کہا کہ یہ مدرسہ کیا ہے بلکہ اس کو ایک کنبہ کہنا چاہیے جس رشتہ میں اُستاد اور شاگرد سب بندھے ہوئے تھے وہ پستالوزی کی محبت تھی۔ بچوں کی معلومات زیادہ نہ تھیں، مگر جو کچھ وہ جانتے تھے بخوبی جانتے تھے لیکن حساب سکھانے میں کامیابی بہت نمایاں ہوئی۔ ایک تاجر یہ دیکھکر حیران رہ گیا کہ بچے کس سہولت کے ساتھ پیچیدہ سے پیچیدہ کسروں کا حساب کر لیتے ہیں کہ گویا اُن سے زیادہ آسان کوئی چیز ہی نہیں۔

پستالوزی کا یہ اصول کہ بچوں اور مددگار معلموں پر کوئی پابندی نہ ہو اور انھیں پوری آزادی ہو۔ بچے اُستادوں سے بے تکلفی کے ساتھ بات چیت کریں اور جس طریقہ سے چاہیں اُنھیں خطاب کریں یعنی بالاختصار یہ کہ مدرسہ کو ایک کنبہ بنا دیا جاے یہ طریقہ گو برگ ڈورف کی تعلیم گاہ میں جہاں نتو سے کم لڑکے تھے بہت کامیاب ثابت ہوا، لیکن یہی اصول جب وردون Yverdun میں برتا گیا جہاں مختلف عمروں اور مختلف مزاجوں کے چار سو سے بھی زیادہ لڑکے تھے تو اس میں بہت ہی سخت ناکامی ہوئی۔ یہ اصول نتو سے کم تعداد طلبہ والے مدرسہ میں تو کامیاب ہو سکتا ہے مگر زیادہ تعداد والے مدرسہ میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ پستالوزی نے غلطی سے ساڑھے چار سو طالب علموں کے مدرسہ میں بھی انتظامات ڈسپلن کے وہی اصول اختیار کئے جو پچھتر لڑکوں کے مدرسہ میں کامیاب ہوئے تھے۔ ہندوستان میں لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ کسی درس گاہ کے انتظامات کی نوعیت اور اُس کے چلانے والی کل اُس کے طلبہ کی امداد پر منحصر ہے۔ لوگ یہ تو سمجھتے ہیں کہ تعداد طلبہ کی زیادتی کے ساتھ اسٹاف کی زیادتی تناسب سے ہونا چاہیے یعنی۔ یہاں تو فقط یہ دیکھا جاتا ہے کہ تعداد معلمین

اور تعداد طلبہ میں تناسب ہو لیکن وہ نہیں سمجھتے کہ تعداد کے ساتھ انتظامات کے اصول بھی بدل دینے چاہئیں۔

جس مدرسہ میں قریباً پچھتر لڑکے ہوں اُس میں منیجر تو کمائی کرنے والا صاحبِ خانہ سمجھا جاتا ہے اور ہیڈ ماسٹر اس کا چھوٹا بھائی اور گھر کا منتظم۔ دونوں بھائیوں کے تعلقات ہمیشہ اچھے ہوتے ہیں۔ کام تقسیم نہیں کیا جاتا۔ ہر کام ہر شخص کر سکتا ہے۔ منیجر اور ہیڈ ماسٹر ہر لڑکے کے ذرا ذرا سے حالات جانتے ہیں اور لڑکے بھی اُن سے پوری طرح واقف ہوتے ہیں منیجر ہیڈ ماسٹر اور لڑکے سب ایک دوسرے سے اسی طرح بے تکلف ہوتے ہیں جس طرح ایک خوش باش اور اچھے گھر کے افراد۔ جب تعداد بڑھ جاتی ہے تو منیجر اور ہیڈ ماسٹر ہر لڑکے کے حالات پوری طرح نہیں جان سکتے اور لڑکے یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اُن سے پوری ہمدردی اور شفقت کا برتاؤ نہیں ہوتا پس مدرسہ میں بے اطمینانی ہونے لگتی ہے۔ اس صورت میں لازم ہے کہ بہت بڑے کنبہ کی طرح صاحب خانہ تقسیم کار کے اصول پر وضاحت کے ساتھ کاربند ہو اور ایک دوسرے کے کام میں دخل نہ دے۔ اب یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ کچھ قواعد بنائے جائیں اور ہر ایک ممبر کے لئے خواہ وہ منیجر ہوں یا اوستاد یا طالب علم یہ لازمی ہو کہ خاص قواعد کے تحت میں ہوں اور اُن کی پابندی کریں اور ڈسپلن کی نوعیت بھی ساتھ ہی ساتھ بدل جانی چاہئے۔ مدرسہ کے انتظام کا اصول اور ڈسپلن کا مرکز فقط افراد کی محبت نہیں ہونی چاہئے بلکہ قواعد کی پابندی بھی لازمی ہے۔

جب لڑکوں کی تعداد چھ یا سات سو سے تجاوز کر جائے تو پھر شخصی محبت اور پابندی قواعد بھی درس گاہ میں نہ انتظام قایم رکھ سکتی ہے اور نہ افراد میں اطمینان اور خوشی قایم رہ سکتی ہے اب ہم ان اصولوں کے جو تمدنی ترقی میں برتے جاتے ہیں اور جن کے ذریعے سے خاندان اور گھرانے بنے ہیں یہ کہیں گے کہ اس کنبہ کو ترقی کنبوں میں تقسیم کرنا چاہئے۔ ہر ایک کا بزرگ خاندان جدا ہو اور اپنے کنبے کو اختیار کلی رکھتا ہو۔ یہ سارے کنبے ایک سرگروہ کے ماتحت ہوں

تاکہ اُن کے باہمی مناقشات میں وہ حکم کا کام دے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک انسٹی ٹیوشن متفرق حصّوں میں تقسیم کر دی جائے۔

"خود ہمارے علی گڈھ کالج میں یہ سب مدارج پیش آچکے ہیں مگر بدقسمتی سے ایک اسٹیج سے دوسرے اسٹیج پر ہم نے ترقی دنیا کے متحدہ تجربوں سے فائدہ اُٹھا کر اصول ارتقا کا تتبع کرتے ہوئے نہیں کی، بلکہ یہ ترقیاں اصول انقلاب سے (جس کو آج کل اسٹرائک کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے) ہوئی ہیں۔

۱۸۷۵ء سے ۱۸۸۰ء تک علی گڈھ کالج پہلی حالت میں تھا۔ کالج کا قابل احترام بانی اکثر کالج بھر کو سیر کرانے کے لئے گاڑیوں میں قلعہ لے جاتا تھا۔ اُن کے اور مسٹر بیک پرنسپل کے تعلقات عمدہ تھے اور دونوں بغیر کسی تقسیم کار کے جو چاہتے تھے کرتے تھے ۱۸۸۰ء کے انقلاب نے کالج کو یکایک دوسرے درجہ میں لاکھڑا کیا۔ پرنسپل کے اختیارات متعین ہوگئے اور بورڈنگ کے قواعد بن گئے۔ بیس سال کے بعد ۱۹۰۰ء میں جو انقلاب ہوا وہ بالکل تقاضائے فطرت کے مطابق تھا اور اس کا اقتضا تھا کہ کالج کو تیسرے درجہ میں پہنچا دیا جائے ۱۹۰۰ء کے تحقیقاتی کمیشن نے اس کا اعتراف کیا مگر اس کے لئے صحیح اصول تجویز نہیں کئے آیندہ کالج کا نظام حکومت کیا ہونا چاہیئے۔ اگر بعض ٹیوٹر اور اسسٹنٹ ٹیوٹر بُرے ہیں تب تو قصور اُن ٹیوٹروں اور اسسٹنٹ ٹیوٹروں کا ہے لیکن سب ٹیوٹر اور اسسٹنٹ ٹیوٹر بُرے ہیں تب قصور اُن کا نہیں بلکہ نظام حکومت کا ہے۔ اب مسلم یونیورسٹی کے قیام کا مسئلہ درپیش ہے جس میں طالب علموں کی تعداد تین چار ہزار تک ہوسکتی ہے اور اس لئے ہمارا کالج اب گویا چوتھے درجہ پر پہنچا چاہتا ہے اس لئے مناسب یہ ہے کہ انتظام کی صورت ایسی قرار دی جائے کہ تبدیل انتظام کے لئے انقلاب اور فساد کی ضرورت نہ پڑے۔

پستالوزی کی قریباً ساری عمر عسرت میں بسر ہوئی۔ وہ خود لکھتا ہے کہ "وارد و صادر

لوگ مجھے دیکھ کر ہنستے ہیں اس لئے کہ میری شکل بھوکے فقیر سے بہتر نہیں ہے۔ ہزاروں مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ مجھے دو وقت کھانا نہیں ملا۔ اور خاص دوپہر کے کھانے کی صورت بھی یہ ہوئی کہ جس وقت غریب سے غریب آدمی اپنے دسترخوان پر دال دلیا کھاتے ہوتے ہیں مجھکو اپنی ناداری کی وجہ سے روٹی کے سوکھے ٹکڑے چلتے پھرتے چبانے پڑے ہیں اور اب تک اسی عسرت اور تکلیف میں مبتلا ہوں"۔

پستالوزی کا طرز عبارت بھی ایسا ہی جیسا اس کا ظاہر تھا۔ یعنی بے قاعدہ ژولیدہ اور عسیر الفہم پستالوزی کا مطلب اصل کتابوں سے ایسا سمجھ میں نہیں آتا جیسا شرحوں سے۔ اس کی کتابوں کا مطلب دوسروں کے اقتباسات اور تشریحات سے مستنبط کرنا زیادہ آسان ہے اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اُس کے اصول موخر ہوتے ہیں اُس کے تجربات سے پستالوزی کا ایک شاگرد لکھتا ہے کہ جس چیز کو پستالوزی کا طریقۂ تعلیم کہتے ہیں وہ ہمارے لئے ایک معمّہ تھا ہمارے اُستادوں کے لئے بھی وہ ایک معمّہ تھا اور ہر شخص اُس شیخ المعلمین کی تعلیم کے معنی اپنی اپنی سمجھ کے موافق لگا لیتا تھا۔

تعلیمات کے جو اصول پستالوزی نے اپنی متذکرہ بالا دونوں کتابوں میں قرار دیے ہیں اور جن پر اُس نے برگ ڈورف Burghorf اور ورڈون Yverdun اور اسٹانز Stanz میں عمل کیا ہے۔

۱۔ تم مجھ سے پوچھتے ہو کہ بچہ کو سکھانا کب سے شروع کرنا چاہئے۔ میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ بچہ کا پہلا سبق پیدا ہوتے ہی شروع ہونا چاہئے۔ جیسے ہی بچہ کے قوائے حاسہ اثرات قبول کرنے کے لئے آمادہ ہوتے ہیں، فطرت سبق آموزی شروع کر دیتی ہے۔

۲۔ خدا نے ماں کو خود وہ قابلیتیں عطا فرمائی ہیں کہ بچہ کا سب سے بڑا معلم بنے۔ اُسے لازم ہے کہ بچہ سے اندھی محبت نہ کرے بلکہ ہر محبت کے ساتھ عقل کو ہاتھ سے نہ کھوئے، اور اپنی محبت اور لاڈ سے بچہ کو ضرر نہ پہنچائے۔

۳۔ بچہ کی تعلیم کیونکر ہو یہ سب سے زیادہ مشکل مسئلہ ہے، بالعموم یہ کام اُن لوگوں کے سپرد کیا جاتا ہے جو اس کی سب سے ادنیٰ قابلیت رکھتے ہیں۔ یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اثرات اوائل عمر میں بچوں پر پڑتے ہیں، اُن کا اثرات آیندہ زندگی میں قایم رہتا ہے اسلئے پوری پوری کوشش کرنا چاہیئے کہ عمدہ اثرات پیدا ہوں۔ اس بات کو لارڈ مارلے نے اپنی کتاب "روسو" میں اس طریقہ سے بیان کیا ہے کہ "اگر سارے عرصہ حیات کو ایک تعلیم گاہ تصور کیا جائے تو اُس شخص کی نسبت جو تمام دنیا کا سفر کرتا ہے یہ کہنا بالکل صحیح ہو گا کہ اتنا اثر اُس پر اُن تمام اقوامِ عالم نے جو اُس کے مشاہدے میں آئیں نہیں کیا جتنا کہ ایک اُس کی دایہ نے کیا ہے"۔ لہٰذا ماں کو چاہیئے کہ خود اپنے بچہ کی دایہ بنے اور اگر دایہ رکھنی ہی پڑے تو اُسکے انتخاب میں بڑی احتیاط کرنی چاہیئے۔

۴۔ فربل کی رائے ہے کہ جب بچہ تین برس کا ہو جائے تو اُسے کنڈرگارٹن مکتب میں بھیج دینا چاہیئے لیکن پستالوزی کی رائے ہے کہ نہیں چھ سال کی عمر تک بچہ کو ماں ہی کے پاس رکھنا چاہیئے۔

(اس بحث میں عملی دلچسپی ہمارے لئے غیر ضروری ہے، اس لئے کہ ہمارے یہاں نہ تعلیم یافتہ مائیں موجود ہیں جو بچوں کی تربیت کر سکیں اور نہ کوئی کنڈرگارٹن مکتب ہی)
واضح ہو کہ تربیت مادرانہ کا تعلق زیادہ تر بچہ کے دل سے ہے دماغ سے نہیں۔

۵۔ پستالوزی اپنی منتہائے تعلیم کو مختصر طور پر یوں بیان کرتا ہے کہ جب بچہ کو شروع ہی سے عبادت کرنے، سوچنے اور کام کرنے کی عادت ہو جائے اُس کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُس کی نصف تعلیم ہو گئی۔

۶۔ لاک Locke کا خیال تھا کہ تعلیم کھیل کے خوشگوار طریقہ سے دینی چاہیئے برعکس اس کے پستالوزی کا قول ہے کہ تعلیم کو خوشگوار طریقہ سے سکھانے سے لڑکے کی تعلیم سطحی رہ جاتی ہے اور تبحر اُس میں پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا اوائل عمر ہی سے یہ امر بچہ کے ذہن نشین کر دینا

چاہیئے کہ تحصیل علم کے لئے محنت اور مشقت لابدی ہے (لیکن بہترین صورت وہ ہی جو ان دونوں کے بین بین ہے یعنی اوّل ہی سے بچّے کے دل میں تحصیل علم کی خواہش پیدا کی جائے اور پھر جو سبق دیا جائے وہ اس طرح دیا جائے کہ بچّہ کو اپنی طبیعت میں خود بخود زور دینا پڑے۔ بچّہ کے لئے طبیعت پر زور دینا ضروری ہے مگر یہ مناسب نہیں کہ بچّہ اُس کو محسوس کرتا رہے کہ میں اپنی طبیعت پر زور دے رہا ہوں)

۷۔ پستالوزی کا مقصود یہ تھا کہ تعلیم کے طریقوں کو آسان کر دے۔ وہ چاہتا تھا کہ تعلیم کو اتنا آسان بنا دے کہ معمولی سے معمولی اُستاد اور جاہل سے جاہل ماں باپ بھی اپنے بچّوں کو تعلیم دے سکیں وہ لکھتا ہے کہ "جب تک ہم تعلیم کے طریقوں کو ایسا آسان نہ بنا دیں کہ ابتدائی مدرسوں کے معلّم اُن طریقوں کے مطابق ایک کل کی طرح تعلیم دے سکیں[۱] یعنی وہ طریقے ایسے ہوں کہ نتائج کا مدار معلّموں کی قابلیت پر نہ ہو بلکہ خود اُن طریقوں کی نوعیت پر ہو اُس وقت تک ہمیں حق نہیں کہ قومی تعلیم کا خواب دیکھیں"۔

۸۔ اخلاقی اور مذہبی تعلیم دماغی تعلیم پر مقدم ہے اور بہت ہی اوائل میں شروع کر دینی چاہیئے یہاں وہ روسو کی مخالفت کرتا ہے جو اٹھارہ برس کی عمر تک کسی قسم کی مذہبی تعلیم دینے کا حامی نہ تھا اور جس کو غلطی کو میں پچھلے باب میں بیان کر چکا ہوں۔ پستالوزی کے نزدیک اخلاقی تعلیم اور مذہبی تعلیم ایک ہی چیز ہے (وہ لوگ بڑی غلطی پر ہیں جو اخلاقی تعلیم کو مذہبی تعلیم سے جدا کر کے تعلیم دینا چاہتے ہیں۔ میری رائے میں تو اخلاقی تعلیم بغیر مذہب کے ایک بے معنی چیز ہی)

۹۔ پستالوزی تعلیم اطفال کی بنیاد تمام تر آن شوانگ پر رکھتا ہے (آن شوانگ ایک جرمن لفظ ہے۔ اس کا صحیح مترادف کسی زبان میں موجود نہیں۔ اس کے معنی قریب قریب یہ ہیں کہ دماغ حالت فعلی میں ہو اور بچّہ مشاہدہ کرے اور خود ہی نتائج اخذ کرے)

---

[۱] یعنی پستالوزی چاہتا ہے کہ تعلیم کے طریقوں کو ایسا بنا دے کہ مثل مشین کے پرزوں کے بلا کسی دقت کے لوگ ان کو برت سکیں

۱۰۔ بچّہ کی انفرادی شخصیت (خاص طبیعت) کا پاس نہایت احتیاط کے ساتھ رکھنا چاہیے اور اُس کو ضایع نہیں ہونے دینا چاہیے۔

۱۱۔ اُستاد اور شاگرد کے تعلقات محبت پر مبنی ہونے چاہئیں۔

۱۲۔ تدریس کو تعلیم کی اعلیٰ غایات کے ماتحت رکھنا چاہیئے یعنی نوشت و خواند تعلیم کے اہم جزو نہیں ہیں پسٹالوزی کے نزدیک تعلیم کے معنی کچھ کتابوں کے جاننے کے نہیں ہیں بلکہ انسان بن جانے کے ہیں جس وقت ہم عام طور سے یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص میں انسانیت نہیں ہے اِس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ فلاں شخص میں انسانیت یعنی تمدنی، معاشرتی، فرائض خوش اسلوبی سے انجام دینے کی اہلیت نہیں۔ گویا تعلیم نہیں ع۔ آدمیت اور شے ہے علم ہے اور چیز یعنی تعلیم ایک اور چیز ہے اور نوشت و خواند یا علوم کی واقفیت ایک اور چیز ہے۔

۱۳۔ تعلیم کا سب سے بڑا اصول یہ ہے کہ جب تک بچّہ مبادی پر پوری طرح حاوی نہ ہو جائے اُسے آگے نہ بڑھایا جائے۔ ہر قدم پر بڑھانے والے کا یہ فرض ہے کہ جب تک جو بات بتائی گئی ہے بچّہ کا جزو دماغ نہ ہو جائے، دوسری بات کی طرف ہرگز قدم نہ بڑھائے (اہلِ مشرق کے نظامِ تعلیم میں اس اصول کی پابندی نہایت التزام کے ساتھ کی جاتی ہے اور اصل میں یہی راز ہے اس نظام کی کامیابی کا)

۱۴۔ بولنا سیکھنے کے بعد بچّہ کو پڑھانا شروع کرانا چاہیے۔ پڑھنا سکھانے کے لئے کٹے ہوئے حرفوں سے کام لینا چاہیے جو پٹھے (وصلی) پر چپکا دیے جائیں۔ لکھنے سے پہلے نقشہ کشی سکھائی جائے۔

۱۵۔ علم الحساب کلّیات کے طور پر نہیں بلکہ صرف اعداد کے ذریعہ سے سکھانا چاہیے اس کے لئے جدول کشی نقشے زیادہ استعمال میں لائے جائیں۔ اور محض اعداد کا بلا کسی شے کو کام میں رکھے گنا مفید نہیں ہے یعنی بچّہ کو یہ سکھانا چاہیے کہ دو آم اور تین آم مل کر پانچ آم ہوتے ہیں، یہ نہیں کہ دو اور تین مل کر پانچ ہوتے ہیں۔

۱۶۔ بچّہ کو کوئی چیز حفظ نہ کرائی جائے۔ ایک آواز سے کسی چیز کو دُہرانا چاہیے اور بلا محنت اگر اس طریقہ سے حفظ کرلیں تو مضایقہ نہیں۔

۱۷۔ دماغی کام کے ساتھ ساتھ ہاتھ اور نظر کے استعمال کی تعلیم بھی دینی چاہیے۔ اور یہ تعلیم مثلاً کاغذ کے ڈبّے اور دیگر اشیاء بنانے اور باغوں میں کام کرنے کے ذریعہ سے دیجائے

جرمن قوم کی توسیع و ترقی تعلیم عامّہ میں پستالوزی کے اصول و طریقۂ تعلیم کا راز مضمر ہے مشہور جرمن فلسفی فشتی Fichte نے ۱۸۰۲ء میں پستالوزی کی تعلیمی جد و جہد کی نسبت ان الفاظ میں داد دی تھی۔

"میرا عقیدہ ہے کہ جرمن قوم کا احیا اور ترقی ہوگی صرف پستالوزی کی درس گاہ سے ہوگی"

پستالوزی نے ۱۸۲۷ء میں اسّی برس کی عمر میں اس جہان فانی سے کوچ کیا۔ بیسویں صدی کے اس شیخ المعلمین نے تمام عمر جس خلوص اور جس خوشی کے ساتھ فن تعلیم و تدریس کی خدمت کی اور جس قسم کی تکالیف اور صعوبتیں برداشت کیں ان کے متعلق جو تفصیلی حالات پستالوزی کے سوانح نگاروں نے بیان کیے ہیں وہ نہایت سبق آموز ہیں۔

## FROEBEL
## فروبل

ہندوستان میں فروبل اور پستالوزی کی مدح سرائی اور عزّت و توقیر تو بہت کچھ کی جاتی ہے مگر اُن کے اُصول اور طریقوں کو جاننے اور اُن کا مطالعہ کرنے والے خال خال ہیں۔ کنڈرگارٹن (گلزار نونہال) کے سلسلہ میں فروبل کا نام تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی زبانوں پر بہت چڑھا ہوا ہے مگر کنڈرگارٹن سے جو مفہوم ہے اُس کے جاننے والے معدودے چند ہیں۔

فروبل، پستالوزی کا پیرو ہے۔ وہ پستالوزی سے ۱۸۰۸ء میں بمقام وردون ملا اور اپنے تین شاگردوں کو بھی ہمراہ لے گیا اور دو سال تک وہاں رہکر پستالوزی کی درسگاہ میں کام کرتا رہا مگر اس نے

پستالوزی کے طریقۂ تدریس کا اتباع اُس کی ملاقات سے قبل ہی شروع کر دیا تھا۔ یہ دونوں نہایت مذہبی آدمی تھے۔ بچوں اور اساتذہ کے ساتھ دونوں کو بیحد اُنس تھا۔ اور کاروباری اُصولوں سے دونوں کو مس نہ تھا۔ فرق دونوں میں اتنا تھا کہ پستالوزی اپنی ناکامیوں کو اپنی ناقابلیت پر محمول کرتا ہے اور برخلاف اس کے فروبل اپنے تئیں خطا و نسیان سے بالاتر سمجھتا ہے۔ اور اپنی ناکامی کو ناقابلیت سے منسوب نہیں کرتا، بلکہ مقدر کی خوبی یا دوسروں کی مخالفت اور رشک پر محمول کرتا ہے۔ پستالوزی کو لباس کی ذرہ بھر بھی پروا نہ تھی۔ لیکن فروبل خوش پوشاک اور فیشن ایبل تھا۔

یہ دونوں اصحاب سائنس کے معتقدین میں سے تھے۔ سائنس کو مذہب کا مخالف نہیں سمجھتے تھے بلکہ اُس کو قدرتِ خدا کا مظہر خیال کرتے تھے۔

فروبل ۱۷۸۲ء میں بمقام ٹھورنجیا Thuringia پیدا ہوا۔ شروع ۱۷۸۳ء میں اُس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ اس کا باپ چونکہ ایک وسیع حصۂ ملک کا پادری تھا اور اُس کو اپنے کام سے مہلت نہ ملتی تھی اس لیے وہ اپنے بیٹے کی خبرگیری نہیں کر سکتا تھا۔ فروبل کو لڑکیوں کے مدرسہ میں داخل کیا گیا اور یہاں اس کو جنگل میں گھومنے کا خوب موقع ملا اور اسی وجہ سے اُس کو مناظرِ قدرت سے خاص تعشق پیدا ہو گیا۔ اس کی سوتیلی ماں کا برتاؤ اس کے ساتھ بیدردی کا تھا، اس لیے فروبل کے ماموں نے بھانجہ کو اپنے پاس بلا لیا اور Stadtilm کے مدرسہ میں اس کو داخل کر دیا جہاں وہ ۴ یا ۵ سال تک رہا۔ ۱۵ سال کی عمر میں فروبل محکمۂ جنگلات کے ایک عہدہ دار کے سپرد کر دیا گیا جہاں دو سال تک امیدواری کرنے کے بعد اُس نے محکمۂ جنگلات میں کام کرنے سے انکار کیا اور اپنے والد کو اس بات پر آمادہ کیا کہ اُسے جینا کی ۱۷۹۹ء یونیورسٹی میں داخل کر دے۔ چنانچہ ۱۷۹۹ء میں وہ یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ یہاں پر وہ ۳۰۰ شلنگ کا مقروض ہو گیا۔ اور آٹھ ہفتہ تک یونیورسٹی کے قیدخانہ میں عام ادائیگی قرضہ کی علت میں اُس وقت تک محبوس رہنا پڑا جب تک کہ اس

والد نے یہ قرض ادا نہ کر دیا۔

۱۸۰۵ء کا سال اس کی زندگی میں ایک فیصلہ کن سال ثابت ہوا۔ ماڈل اسکول فرانکفورڈ کے پرنسپل ڈاکٹر گرونر Dr. Gruner نے اسے مشورہ دیا کہ وہ انجنیری کے پیشہ کو خیر باد کہے اور معلّمی کا پیشہ اختیار کرے۔ قدرے تذبذب کے بعد اس نے اس مشورہ کو قبول کر لیا اور جو انبساطِ قلبی و مسرّت دلی اسے پہلی مرتبہ مدرسہ کو دیکھ کر پیدا ہوئی اس سے اس کو یقین واثق ہو گیا کہ جو کام اب اس کے سپرد ہوا وہ عین اس کی فطرت کے مطابق تھا اور جیسا کہ وہ خود کہتا ہے "گویا اب مچھلی پانی میں آگئی"۔

چند روز کے بعد فروبل نے اپنے باپ کو لکھا کہ "یہ حیرت انگیز امر ہے کہ مجھے اپنے فرائض کی ادائگی سے کیسی مسرّت ہوتی ہے۔ اوّل ہی سبق پڑھانے سے مجھے معلوم ہو گیا کہ میں نے دنیا میں اب تک کوئی کام نہیں کیا تھا۔ اور میں معلّمی کے پیشہ کے لیے خلق کیا گیا ہوں"۔

اِس نے اپنی فطری رجحان یا مطالعہ سے تصوّف کا ذوق اپنے اندر پیدا کر لیا تھا اور اس لیے وہ ہر چیز کی علّت کو علّت العلل یعنی خدائے تعالیٰ سے متعلق کرتا تھا۔

فروبل کا قول ہے کہ "

جس شخص کے نزدیک تمام اشیائے مختلفہ اصل میں ایک ہوں، جو تمام چیزوں کو ایک ہی ذات سے نسبت دے اور ایک ہی ہستی کو تمام اشیا کا ماخذ سمجھے وہی شخص خدائے وحدہٗ لاشریک کا معتقد اور اپنے عقیدہ میں مستقل ہو سکتا ہے"۔

فروبل کے نزدیک بھی تعلیم کی غرض و غایت بعینہ وہی ہے جو مسلمان علمائے دین بیان کرتے ہیں یعنی تعلیم کی غرض و غایت یہ ہونی چاہیئے کہ انسان کو پاکیزگی کی زندگی بسر کرنے کے قابل بنائے اور توحید باری تعالیٰ کی ہدایت کرے۔ اس کے ذریعہ سے معرفت نفس

اور خالق و مخلوق کا علم حاصل ہو جس سے انسان پاکیزہ اور متقیانہ زندگی بسر کرنے کے قابل ہو۔

سنہ ۱۸۰۸ء میں فروبل ہمراہی اپنے تین شاگردوں کے ورڈون گیا اور دو سال پستالوزی کے پاس اس غرض سے رہا کہ وہ پستالوزی کے طریقۂ تدریس سے واقفیت حاصل کرے چنانچہ فروبل بیان کرتا ہے کہ یہ زمانہ اس کی زندگی میں ایک فیصلہ کن زمانہ تھا۔

ورڈون سے مراجعت پر گاٹنجن اور برلن کی یونیورسٹیوں میں مطالعہ علم میں مشغول رہا اور سنہ ۱۸۱۳ء میں وہ پروشیا کی فوج میں داخل ہو گیا۔ نپولین کے خلاف جنگ میں نمایاں حصہ لیا اور لڑائی کے اختتام پر اس نے اپنی درسگاہ کیل ہاؤ (Keilhau) میں جاری کی جس میں اس نے اس اصول کا اتباع کیا کہ مطالعہ کتب کے ساتھ (Maunal Labour) عملی تعلیم (جس میں ہاتھ اور آنکھ دونوں سے کام لینا پڑے) کو شامل کر کے شاگرد کے قوائے عملی کو بیدار کیا جائے۔ کیل ہاؤ کے مقام پر سنہ ۱۸۲۶ء میں فروبل نے اپنی تصنیف تعلیم انسان کو شایع کیا Education of man۔ اس وقت تک کنڈرگارٹن (گلزار نونہال) کا خیال اس کے دماغ میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس کتاب میں فروبل نے اپنے طرزِ تعلیم کے عملی طریقہ نہیں بتائے بلکہ زیادہ تر اپنے اصولِ فلسفہ کو مبہم طور پر بیان کیا ہے۔

اِس کتاب کو لوگ شاذ و نادر ہی پڑھتے ہیں اور قدرے بعید الفہم بھی ہے۔ فروبل کی تصانیف کو اس کے شارحین کے شرحوں کی مدد سے مطالعہ کرنا زیادہ مناسب ہے کیونکہ خود اس کتاب کو پڑھنا اور اس کے مطالب کو سمجھنا دشوار ہے۔

کیل ہاؤ کی درسگاہ میں ہیدیاک کے طریقے کے مطابق یونانی زبان کی تعلیم لاطینی سے پہلے دی جاتی تھی اور اس غرض سے کہ طلبہ کے تمام قوائے کو ایک ساتھ عمل کا موقعہ ملے طلباء سے لیبارٹریز (تجارت) گاہ اور کھیتوں میں کام کرایا جاتا تھا۔

اس مدرسے کے متعلق حکومت وقت کو بدگمانی پیدا ہو گئی اس لیے سنہ ۱۸۲۹ء میں مالی مشکلات

کی بنا پر وہ بند ہو گیا۔ اس پر فروبل سوئٹزرلینڈ چلا گیا، جہاں اس سے خواہش کی گئی کہ برگ ڈارف میں ایک دار الیتامیٰ جاری کرے۔ اس مقام پر تیس سال قبل پسٹالوزی نے نہایت کامی کے ساتھ تعلیمی کام کیا تھا۔

بالآخر سوئٹزرلینڈ کی حکومت نے فروبل کی خدمات کو تسلیم کیا اور اس کا تقرر ایک مستقل معلم کی حیثیت سے کردیا۔ فروبل اس کا قائل تھا کہ مدرسہ کی تعلیم کے لیے مناسب و موزوں بنیاد لازمی ہے یعنی مدرسہ کی تعلیم شروع ہونے سے قبل بچے میں خانگی تربیت سے ایسا مادہ پیدا ہو جائے جس سے مدرسہ کی تعلیم سے پورا نفع حاصل ہو۔ فروبل کومی نس کی تصانیف سے بہت متاثر تھا اور اس نے کنڈرگارٹن کے خیال کو کومی نس کے مکتب مادری کے طرز پر اپنے دماغ میں پختہ کیا۔ اس مقام پر میں کنڈرگارٹن کے حالات سے بدیں وجہ قطع نظر کرتا ہوں کہ اس مضمون کو جداگانہ حیثیت سے بیان کردیا۔ فروبل نے بوجہ زوجہ اپنی کی علالت کے سوئٹزرلینڈ کا قیام ترک کردیا۔ اور جرمنی واپس چلا گیا۔ جہاں اس نے بقیہ ایام زندگی کنڈرگارٹن کے طریقہ کو رائج کرنے میں بسر کئے۔ اس نے بلینکن برگ (Blankendurg) مقام میں ایک مدرسہ کھولا اور جرمن گورنمنٹ سے اپنے کام کے لیے امداد کی استدعا کی جس میں اس کو ناکامی ہوئی۔ اس لیے بوجہ تھوڑے ذرایع آمدنی کے اس کو اپنا مدرسہ بند کردینا پڑا۔

فن تعلیمات کی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ تھا۔ کہ فروبل نے اس زمانہ میں عورتوں کی اس حیثیت کو قدر کی نگاہ سے دیکھا کہ تعلیم دینے میں ان کی اہمیت کا کیا درجہ ہے۔

فروبل نے اس بات کو محسوس کرلیا کہ چھوٹے بچوں کو گھر پر تربیت کرنا جس کا پسٹالوزی بہت سرگرم حامی تھا۔ کس قدر ناممکن العمل ہے۔ اس کا قول ہے کہ اکثر ماؤں کو نہ تو اتنا وقت ملتا ہے اور نہ ان میں اس کی اہلیت ہوتی ہے۔ کہ وہ گھر پر بچوں کی تربیت کرسکیں، اس لیے اس نے خانگی تعلیم و تربیت کے بجائے کنڈرگارٹن کو جگہ دی۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ کنڈرگارٹن کے

طریقے پر تعلیم دینے کے لیے کِیل ہاؤس جہاں اُس نے اپنی درسگاہ جاری کی تھی بسر کر دیئے
فروبل اکثر کہا کرتا تھا کہ:-

"قوموں کی قسمت کی باگ بہت کچھ عورتوں کے ہاتھ میں ہے نہ کہ قوت اور طاقت کے حصول پر یا اُن لوگوں پر جو طرح طرح کی ایجادات و اختراعات کریں ہم پر لازم ہے کہ ہم عورتوں کی تعلیم دلائیں کیونکہ وہ نسل انسانی کی تعلیم دہندہ ہیں ورنہ نئی نسل اپنے فرائض کو انجام دینے سے قاصر رہیگی۔"

پینٹر Painter کا قول ہے کہ:-

"کہ تمام اصطلاحات جو امریکہ و یورپ میں واقع ہوئی ہیں وہ عورتوں ہی کے ذریعہ سے ہوئی ہیں اور خوش قسمت ہے وہ تحریک جس کے ساتھ عورتوں کی ہمدردی شامل ہے۔"

سنہ ۱۸۵۱ء میں اس پر لامذہبی اور اشتراکیت کا شبہ کیا گیا اور پروشیا کے وزیر تعلیمات نے فروبل کے اصولوں پر مدارس جاری کرنے کے لیے امتناعی حکم صادر کیا۔ یہ حکم سنہ ۱۸۶۲ء تک نافذ رہا۔ سنہ ۱۸۵۲ء میں فروبل نے وفات پائی تعلیم کے متعلق جن اصولوں کا فروبل موئد تھا وہ اس کی تصنیف "انسان کی تعلیم" میں مندرج ہیں۔

۱۔ اپنی کتاب کے دیباچہ میں وہ ثابت کرتا ہے کہ ہر چیز کا خالق اور ہر چیز کا منبع خدا ہی اس کا اعتقاد تھا کہ تمام مشاہدات قدرت خلّاقِ عالم کی قدرت کاملہ کا بلا واسطہ مظہر ہیں

۲۔ فروبل کہتا ہے کہ تعلیم کا کوئی عام اصول ایسا نہیں ہے جو ہر متنفس کے لیے یکساں ہو کیونکہ ہر بچہ کی فطرت اور اس کی انفرادی حالت کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ معلّم کو چاہیئے کہ ہر بچہ کے مناسب حال طریقۂ تعلیم ایجاد کرے۔

یہ خیال جماعت بندی کی تعلیم کے خلاف ہی اور خود فروبل جماعت بندی کی تعلیم کا مادرِ
تعلیم کے بدلے میں موئد ہی۔ پچھلے باب میں اسی اصول کے متعلق ہم پستالوزی کے اصول
کو لکھ آئے ہیں کہ وہ تمام فنِ تعلیم کو ایک کل میں ڈھالنے کا موئد تھا۔

۳- بچّوں کے کھیل تعلیم کا ضروری جزو ہیں۔ جو گراں بہا خدمات تعلیم کے باب میں فروبل نے انجام دی ہیں اُن میں سے ایک خدمت یہ ہی کہ اُس نے کھیل کو بچّوں کے دماغی اور جسمانی نشو و نما کا ایک آلہ قرار دیا ہی۔ اس کا قول ہی کہ "بچّوں کے کھیل اُن کی تمام آیندہ زندگی کے لیے بمنزلہ تخم کے ہیں، کیونکہ کھیلوں میں ہی کامل انسان نشو و نما پاتا اور اپنی قابلیتوں کو ظاہر کرتا ہی۔ انسان کی کل زندگی کا منبع یہی زمانہ حیات ہوتا ہی"

اِس نے ایک مقام پر یہ بھی لکھا ہی کہ "اگر میں ایک بچّے کو کھیلتے ہوئے دیکھوں تو میں بتلا دونگا کہ آیندہ زندگی میں وہ کیا ہوگا۔ چنانچہ وہ کہتا ہی کہ:-

"میں بچّوں کے طباعی اُن کے چنچلے پن اور کھیل کود کو اپنے کام کا آلہ بنا سکتا ہوں اور ان کے کھیل کو کام کاج میں تبدیل کر سکتا ہوں اس کا تصوّر میں نے خود بچّوں ہی سے حاصل کیا ہی اور خود بچّوں ہی سے میں نے یہ سیکھا ہی کہ اُن کو کس طرح تعلیم دی جائے"

۴- فروبل نے صاف طور سے محسوس کر لیا کہ بچّوں کی امتیازی خصوصیت "چنچلا پن" ہے، یعنی ابتداءً جسمانی چنچلاپن اور اعضا کے حرکت دینے میں خوشی حاصل ہونا اور اُس کے بعد دماغی بے چینی اور ہر چیز کے متعلق تجسُّس اور اس کی ماہیت معلوم کرنے کی خواہش اور اُن اشیاء کے متعلق دریافت حال جو ان کے محسوسات پر متاثر ہوں۔

فروبل نے خاص طور سے اس کو نوٹ کیا کہ بچّوں میں ہاتھ پیر چلانے کا خاص ذوق ہوتا ہی اُن کو اس سے خوشی حاصل ہوتی ہی کہ اپنے ہاتھوں میں کسی چیز کو لیں اور اُلٹ پھیر کریں۔ ان میں خود کام کے ایجاد کرنے کی بہت قدرت ہوتی ہی اگر تم اُن کے ہاتھ میں چاک یا گندھا ہوا

اٹھا دے دو تو وہ معلومہ اشیاء کے نمونے بنانے لگیں گے۔

قدرتاً بچّے مدنی الطبع اور ہم جولیوں کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں بچّے اکثر ایسے جذبات اور ملکات کو آپس کے میل جول اور کھیل کود میں نشوونما دے لیتے ہیں اور ایک دوسرے کے نقائص اس عمدگی کے ساتھ درست کر لیتے ہیں جیسا بڑوں سے ممکن نہیں۔ یہ خیالات اس کے طریقہ کنڈرگارٹن کے بمنزلہ بنیادی اُصول کے تھے۔

جو بیش بہا خدمات اس نے تعلیم نوع انسان کی کی ہیں اور جن کی وجہ سے فروبل کا نام ہمیشہ کے لیے صفحاتِ تاریخ پر روشن رہیگا وہ یہ ہیں:-

۱- ماؤں کی تربیت کے بجائے جو اکثر جاہل، مصروف کار، اور اندھی محبّت سے مغلوب رہتی ہیں مدارسِ اطفال قایم کرنا اُن مدارس کے لیے ایک نئے طریقہ کا ایجاد کرنا

۲- اس نے بچّوں کے کھیلوں کو تعلیم کا آلہ بنایا اور اس نئے طریقہ کو مدارس اطفال میں جاری کیا۔ یعنی کنڈرگارٹن۔

۳- اسی نے سب سے پہلے عورتوں کی اس اہمیت کو کہ وہ اطفال کے مدارس میں مردوں سے زیادہ مفید ہیں۔ واضح طور سے بیان کیا اور عملاً کر کے دکھلایا۔

---

## HERBERT SPENCER

## ہربرٹ اسپنسر

(۱۸۲۰-۱۹۰۳)

اکثر کہا جاتا ہے کہ جس شخص کو فنّ تعلیم کا عملی تجربہ حاصل نہو وہ اس موضوع پر کوئی قابلِ قدر تصنیف نہیں کر سکتا۔ یہ خیال صحیح نہیں، کیونکہ یہ اکثر واقع ہوتا ہے کہ ایک غیر شخص جو اس پیشہ کی مخصوص روایات اور خصوصیات سے ناآشنا ہو وہ اُن حقایق کو معلوم کر لیتا ہے جو ایک

معلم کی نظر سے بوجہ عملی دشواریوں پر غالب آنے کی مصروفیت کے پوشیدہ رہتی ہیں۔ ہربرٹ اسپنسر کا بھی یہی حال ہے۔ فن تعلیم کے متعلق اس کا تجربہ صرف تین ماہ کی مدت تک محدود تھا یعنی اس نے اپنی نوجوانی کے زمانہ میں تین ماہ کے لیے ایک معلم کی حیثیت سے قائم مقامی کی تھی۔

ہربرٹ اسپنسر ۱۸۲۰ء میں پیدا ہوا۔ دادا، چچا اور باپ سب معلم پیشہ تھے۔ زمانہ طالب علمی میں وہ ایک لاپرواہ بلکہ کاہل شاگرد تھا۔ درسی کتاب سے رغبت نہ تھی البتہ سائنس وغیرہ سے اسکو دلچسپی تھی۔ السنہ قدیمہ کے مطالعہ کرنے اور کیمبرج میں داخل ہونے پر وہ آمادہ نہ تھا اس لیے ۱۸۳۶ء میں اس نے اسکول چھوڑ دیا۔ ۱۸۳۷ء وہ سول انجنیر کا اسسٹنٹ مقرر ہو گیا اور نقشہ کشی اور ریاضی سیکھی اور بالآخر اس نے علم الجمادات کا مطالعہ کیا جس سے اس کو اصولِ ارتقا کا تصوّر پیدا ہوا۔

۱۸۶۱ء میں اس نے اپنی کتاب تعلیم کے موضوع پر شایع کی۔ اس کی سب سے زیادہ شہرت کا باعث اس کی کتاب "فلسفۂ ترکیبی" ( Synthetic Philosophy ) ہے جس میں وہ وفات کے زمانہ تک جو ۱۸۸۳ء میں واقع ہوئی مصروف رہا۔ ۱۸۸۲ء میں امریکہ گیا جہاں اُس کا بہت کچھ خیر مقدم کیا گیا۔ ۱۸۸۳ء میں فرانسیسی اکاڈمی کا ممبر منتخب ہوا۔

ہربرٹ اسپنسر نے تعلیم کی تعریف حسب ذیل الفاظ میں کی ہے:-

"تعلیم کو جو فرض ادا کرنا پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم کو پوری طرح کامل معاشرت کے لیے تیار کردے"۔ کیونکہ پوری طرح یا کامل معاشرت کے لیے ہم کو یہ جاننا ضروری ہے کہ "جسم کے ساتھ کس طرح سلوک کرنا چاہیئے؟ نفس کے ساتھ کس طرح سلوک کرنا چاہیئے؟ اپنے معاملات کا کس طرح انتظام کرنا چاہیئے؟ بال بچوں کی پرورش کس طرح کرنی چاہیئے؟ تمدنی حیثیت سے یعنی باشندہ بن کر کس طرح برتاؤ کرنا چاہیئے؟ خوشی کے ذرایع جو قدرت نے مہیا کیے ہیں اُن سے کس طرح فائدہ اٹھانا چاہیئے؟"

ہربرٹ اسپنسر نے تعلیم کی جو تعریف مندرجۂ بالا الفاظ میں کی ہے اس کا موازنہ پستالوزی اور رسکن کے الفاظ سے کرنا مناسب ہوگا۔ پستالوزی کے نزدیک :-

"تعلیم سے غرض یہ نہیں ہے کہ آدمی کچھ جان جائے بلکہ یہ ہے کہ کچھ ہو جائے یعنی انسان بن جائے۔"

رسکن کہتا ہے :-

"تعلیم کی غرض و غایت یہ نہیں ہے کہ جو ہم نہیں جانتے ہیں وہ جان لیں بلکہ غرض یہ ہے کہ ہمارا رویہ اور برتاؤ درست ہو جائے۔"

وہ اس بات پر بحث کرتا ہے کہ مسئلہ تعلیم میں دو اہم سوال ہیں :-

(۱) تدریس و مطالعہ کے لیے مضامین کیا ہونے چاہئیں؟

(۲) کن طریقوں سے ہم بچوں کو اُن کے مناسب حال مضامین کی تعلیم عمدگی اور تیزی کے ساتھ دیں۔

مضامین کے انتخاب میں سب سے پہلے منفعت کا خیال کرنا چاہیئے اور مناسبت اور خوشگواری کا اس کے بعد تعلیم کی مثال بعینہ لباس کی سی ہے ہم لباس میں ضرورت کو آسایش پر قربان کر دیتے ہیں۔ عورت سب سے پہلے زیب و زینت اور فیشن کا خیال کرتی ہے۔ اور جب تک اُدھیڑ عمر میں نہیں پہنچتی ہے وہ لباس و پوشاک کے استعمال میں عقل سے کام نہیں لیتی یہی حالت تعلیم کی ہے جو علم دماغی تربیت اور ذہانت کے ممد ہیں اُن کو ان علوم پر فوقیت دی جاتی ہے جو ہماری خوش حالی اور آسایش کے حصول میں معاون ہیں۔

مضامین کے انتخاب میں ہم صرف یہ ثابت کرنا چاہیئے کہ فلاں مضمون کارآمد ہے بلکہ یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ وہ اس مضمون سے زیادہ کارآمد و مفید ہے جو مساوی وقت میں برابر سہولت کے ساتھ سکھلایا جا سکتا ہو۔

روسو کا یہ عقیدہ تھا کہ بچہ خلقتاً نیک ہوتا ہے اور اس نیکی کو قایم و برقرار رکھنے کے لیے

اس نے بچّے کو سوسائٹی سے علحدہ رکھنے کا مشورہ دیا۔ برخلاف اس کے اسپنسر بچّے کو گنہگار تو نہیں کہتا، لیکن اس کو وحشی قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ تعلیم اُس کو مہذّب بنا دیگی۔

مُفید اور کار آمد مضامین کے انتخاب میں ہم کو مندرجۂ ذیل اعتبارات سے منفعت کے مسئلہ پر غور کرنا چاہیئے۔ امور مندرجۂ ذیل اہمیت کے لحاظ سے درجہ بدرجہ درج کیے جاتے ہیں:۔

(۱) تحفّظِ جسمانی۔

خواہ کوئی شخص کیسا ہی عالمِ متبحر، محبِّ ملک، مہذّب و متمدّن کیوں نہو لیکن اگر وہ اپنی ذات، اور اپنی جان کی حفاظت کرنا نہیں جانتا یہ سب کمالات اُس کے لیے ہیچ ہیں۔

(۲) بالواسطہ تحفّظِ ذاتی۔ یعنی صحتِ جسمانی۔

اس کا اُصول ان مادّی چیزوں کی بہم رسانی پر ہے جو لازمۂ زندگی ہیں۔

(۳) خاندان۔

(۴) معاشرتی و سیاسی زندگی۔

اِس سے مطلب یہ ہے کہ جو شخص اپنی اور اپنے خاندان کی خدمت سے فارغ ہو چکا ہو وہ ملک و قوم کی خدمت پر آمادہ ہو۔ اسپنسر اُن لوگوں کی سیاسی یا تمدّنی اور قومی خدمات کا قائل نہیں ہے جو اپنی ذات اور اپنے خاندان کی خدمت سے گریز کرتے ہیں۔

(۵) فنونِ لطیفہ۔

جس میں شعر، شاعری، نقّاشی اور مصوّری وغیرہ شامل ہیں۔

اب ہم اِن مضامین پر بحث کرتے ہیں جو متذکرہ بالا پانچ فرائض کی باحسن وجوہ انجام دہی کے لیے ضروری ہیں۔

۱۔ یہ انسان کی خوش قسمتی ہے کہ پہلا فرض یعنی تحفظِ جسمانی خود قدرت نے اپنے اختیار میں رکھا ہے۔ اس کے لیے فزیالوجی (علم الابدان) کی تعلیم کا اسپنسر مشورہ دیتا ہے۔

۲- بالواسطہ تحفظِ جسمانی کے لیے اسپنسر ریاضی، طبیعیات، علم الحیات کا مشورہ دیتا ہے کیونکہ یہی علوم تمام پیشوں کے لیے بمنزلہ بنیاد کے ہیں۔ مجھے خود اس میں شک ہے کہ آیا علم سائنس کبھی حصولِ زر کا آسان ذریعہ ہو سکتا ہے۔ جو لوگ دنیا میں دولت کماتے ہیں وہ سائنس داں نہیں ہوتے بلکہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو سائنس دانوں کے علم و حکمت کو طلب منفعت کا ذریعہ بنانا خوب جانتے ہیں۔ ہربرٹ اسپنسر کی تجویز پر اگر عمل کیا جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر متنفّس کو مدرسۂ صنعت و حرفت میں داخل ہو کر کسی نہ کسی حرفت یا پیشہ کی تعلیم سیکھنا پڑیگی۔

۳- اسپنسر کے نزدیک بچّوں کو عمدہ طور سے پرورش کرنے کی تعلیم بھی نصاب تعلیم کا جزو ہونا چاہیئے۔

(اس قسم کی تعلیم کی اہمیت سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اور اس بارہ میں والدین کی ناواقفیت بہت افسوسناک ہوتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ نوعمروں کو ایسی تعلیم اس عمر میں دینا جب کہ وہ فرائضِ والدین سے ناآشنا ہوتے ہیں آیا کچھ نتیجہ خیز ہو سکتی ہے یا نہیں۔ یہ تعلیم تو جوانوں کو ۱۶ برس کی عمر کے بعد دینا چاہیئے۔)

۴- انگلستان میں جب یہ فارمل پیش ہوا ہے اُس وقت ڈاکٹر آرنلڈ صاحب نے نصاب تعلیم میں اُن مضامین کے شامل کرنے کی اہمیت پر نہایت زور دیا تھا جو انسان کو باشندہ ملک ہونے کے فرائض کی ادائگی کے قابل بنائیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے ہم کو کس قسم کی تعلیم دینا چاہیئے؟ ایک مضمون جو خاص کر موزوں معلوم ہوتا ہے علم تاریخ ہے مگر اسپنسر کی رائے ہے جو کتب تاریخ ہیں اس زمانہ میں تصنیف ہوئی ہیں وہ حصول مقصد کے لیے مفید نہیں۔ چنانچہ کتب تاریخ کے بارے میں اس کی رائے یہ ہے:-

"مدرسوں کی تاریخوں میں شاذ و نادر اور بسوط تاریخیں جو بڑے آدمیوں کے

کے واسطے لکھی گئی ہیں اُن میں بہت کم ایسے واقعات درج ہوتے ہیں جنھیں ملکی معاملات کے صحیح اُصول کو صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہو۔ بادشاہوں کی سوانح عُمریاں (اور ہمارے بچّوں کی تاریخ کی تعلیم سے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔) علم تمدّن پر بہت ہی کم روشنی ڈالتی ہیں۔ درباری سازشوں منصوبوں دست درازیوں اور جملہ اشخاص متعلقہ کے حالات کی واقفیت قومی ترقی کے اسباب کی توضیح میں بہت کم مدد دیتی ہے۔ تاریخوں میں ہم عموماً اس قسم کی باتیں پڑھتے ہیں کہ فلاں جنگ فلاں خرخشہ۔ اقتدار و تسلّط کی غرض سے پیش آیا۔ دونوں طرف کی فوجیں میدانِ جنگ میں خوب جم کر لڑیں۔ سپہ سالار اور اُن کے بڑے بڑے ماتحتوں کے یہ نام تھے۔ ہر ایک کے پاس اتنے ہزار سوار اور پیادے اور اتنی توپیں تھیں۔ اس اس ترتیب سے اُنھوں نے اپنی اپنی فوجوں کو میدانِ جنگ میں صف آرا کیا۔ اور فلاں فلاں طریقے سے اُنھوں نے حکمتِ عملی سے کام لیا حملہ کیا اور پس پا ہوئے۔ اِن کے فلاں حصّہ میں فلاں مصیبتیں پیش آئیں اور فلاں حصّے میں یہ یہ فائدے حاصل ہوئے۔ ایک خاص وقت میں فلاں مشہور سردار کام آیا۔ ایک اور موقع پر کسی خاص رجمنٹ کا دسواں حصّہ ضایع ہو گیا۔ لڑائی کی قسمت کے تمام انقلابات کے بعد فلاں فوج فتح یاب ہوئی۔ اور ہر طرف سے اتنے آدمی مقتول و مجروح ہوئے اور اس قدر آدمیوں کو فتح مندوں نے گرفتار کیا۔ اب بتاؤ کہ ہر واقعہ کی ذرا ذرا سی باتیں جو جمع کی گئی ہیں اُن سے کونسی بات تمدّنی حیثیت سے تم کو اپنے چال چلن کا فیصلہ کرنے میں مدد دیتی ہے؟ بالفرض تم نے نہ صرف "دنیا کی فیصلہ کن پندرہ لڑائیاں" بلکہ اُن تمام لڑائیوں کا حال پڑھ لیا جو تاریخ میں مذکور ہیں۔ بھلا اس علم سے پارلیمنٹ کے آیندہ انتخاب کے موقعہ پر

پر تمھاری رائے میں کیا واقعیت پیدا ہو جائیگی ؟ مگر تم کہتے ہو کہ "یہ واقعات ہیں۔ دلچسپ واقعات ہیں،" بلاشبہ یہ واقعات ہیں دکم سے کم وہ حصّہ جو کلاً یا جزاً جھوٹ اور بناوٹ نہیں ہی، مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ وہ واقعات قابلِ قدر ہیں۔ مصنوعی اور فاسد رائے کی بدولت اکثر اوقات ناکارہ چیزوں کو ظاہری قدر و قیمت حاصل ہو جاتی ہی۔ اگر کوئی شخص تم سے کہے کہ کل تمھاری پڑوسی کی بلّی نے بچّے دیئے ہیں تو تم کہوگے کہ یہ اطلاع فضول ہی۔ اگرچہ یہ بھی واقعہ ہی مگر تم اس کو فضول اور بے معنی واقعہ کہوگے (ایسا واقعہ جس کا اثر تمھاری زندگی کے کاموں پر مطلق نہیں ہو سکتا) اچھا۔ اِسی معیار کو تاریخی واقعات کے کثیر المقدار ذخیرے پر عاید کرو۔ اور تم اُسی نتیجہ پر پہنچوگے یہ ایسے واقعات ہیں کہ ان سے کوئی نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔ یعنی واقعات غیر منضبط اور اسی وجہ سے چال چلن کے اُصول قایم کرنے میں جو واقعات کا اصل مقصد ہی اور کچھ کارآمد نہیں ہوتے۔ اگر تم چاہو تو دل بہلانے کی خاطر اُن کو پڑھو مگر اپنے دل کو اس بات سے تم پھسلاؤ کہ یہ واقعات مُفید ہیں۔ . . . "

فنِ تعلیم کے ایک مستند اہل الرائے مسٹر کوئک نے اسپنسر کی اس رائے پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہی کہ "کتب تاریخ کی تصنیف کا ڈھنگ زمانہ حال میں بہت کچھ تبدیل ہو گیا ہی۔ سیر و سیاحت کی طرح کتب تاریخ کے مطالعہ سے طالب علم کی نظر میں وسعت پیدا ہوتی ہی۔ اس کے خیالات کو ایک جزو تک گرد و پیش کی جکڑ بندیوں سے آزادی ملتی ہی اور وہ دُنیوی پابندیوں کو قوانین فطرت سے مخلوط کرنے کی غلطی کا مرتکب نہیں ہوتا۔" اس کے بعد مسٹر کوئک کہتے ہیں کہ سیاسی کارروائی کے صحیح اُصولوں کے متعلق ہم بالکل تاریکی میں ہیں۔ ہم نوجوانوں کے لیے جو کچھ بھی کر سکتے ہیں وہ صرف اس قدر ہی کہ ہم اُن میں اُن کی اُن ذمہ داریوں کا احساس پیدا کردیں جو اُن پر آیندہ زندگی میں عائد ہونگی اور اُن خطرات سے آگاہ کردینا بھی ایک امر

ضروری ہے جو ان کو اور سلطنت کو عوام الناس کی کورانہ تقلید کرنے میں جیسا کہ فی زمانہ دستور ہے وابستہ ہیں۔"

اس بارے میں اسپنسر کی تجویز ہے کہ ایسی کتب تصنیف کی جائیں، جن میں ترقی کے حالات مندرج ہوں اور جو اقوام کی تاریخ ہی پر مشتمل ہوں جن میں ناموران زمانہ کے حالات ہی کا بیان ہوتا ہے۔

۵۔ سب سے آخر میں ایسے مضامین کی تعلیم دینی چاہیے جو تفریح طبع و تربیت مذاق اور انسانوں کے آرام و آسایش سے متعلق ہیں یعنی فنونِ لطیفہ جس میں مصوری، نقشہ کشی، موسیقی اور شعر و شاعری داخل ہیں۔ اسپنسر کے نزدیک جس طرح زندگی کا زمانۂ فرصت ان کاموں میں صرف ہوتا ہے اسی طرح تعلیم کا زمانۂ فرصت اُن میں صرف ہونا چاہیے۔ یا بالفاظ دیگر ان کی تعلیم و تربیت اُس وقت ہونا چاہیے جب کہ دوسرے ضروری مضامین کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وقت بچے اور موقع حاصل ہو۔ لیکن اسپنسر نے جن علوم و فنون کے تحصیل کے متعلق مشورہ دیا ہے اُن میں سے کسی ایک علم کے پورے طور پر حاصل کرنے میں تمام عمر صرف ہوسکتی ہے اور اس لیے زندگی کے زمانۂ فرصت کا خیال کرنا اُمید موہوم ہے، اور اس لیے یہ کہنا بالکل حق بجانب ہوگا کہ شعر شاعری، موسیقی اور نقاشی اور وہ تمام ہُنر جن پر فنونِ لطیفہ کے الفاظ عائد ہوتے ہیں اسپنسر کے یہاں ان کی ایسی ناقدری ہے جیسی کہ ریپلک کے زمانہ میں تھی۔

آج کل جب کہ مادیت پرستی کا چرچا ہے اسپنسر کا یہ اُصول کہ ہم کو صرف کارآمد مضامین کی تعلیم دینا چاہیے (جو افلاطون کے قایم کردہ اُصول علم کو علم کی غرض سے حاصل کرنے کے سراسر خلاف ہے۔) بہت پسندیدہ معلوم ہوتا ہے لیکن جب ہم اس اصول کی مطابق نصابِ تعلیم مرتب کرنے بیٹھتے ہیں اُس وقت ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ اس رائے پر عمل کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

میری رائے میں ہمیں جسمانی اور دماغی تربیت پر اپنی توجہ کو منحصر کرنا چاہیے۔ جسمانی اور دماغی تربیت مُفید مضامین کے ذریعے سے ہوسکے تو اولیٰ تر ہے۔

اسپنسر کی تصنیف کا دوسرا حصّہ اُن طریقوں کی بحث سے متعلق ہے جن کے مطابق بچوں

کی تعلیم ہونا چاہیئے۔ چنانچہ اس کی بابت "عقلی تعلیم" کے عنوان کے تحت میں اسپنسر نے اپنی کتاب میں بحث کی ہے۔ اور یہی حصہ اس کی تصنیف کا بہت زیادہ عملی باتوں سے متعلق ہے۔ اس کا خیال ہے کہ "فنّ تعلیم میں بھی اُصول ارتقا کا پورا لحاظ رکھنا چاہیئے"۔ چنانچہ اس کا قول ہے کہ "فنّ تعلیم اس وقت تک ایک منضبط فن کی صورت اختیار نہیں کرسکتا جب تک کہ عقلی ارتقا کے قوانین صحیح طور پر قایم نہ ہوجائیں"۔

ہربرٹ اسپنسر نے مندرجۂ ذیل اُصول قایم کیے ہیں جن میں سے اکثر تو وہ ہیں جو اس سے قبل کومی نی اور اس کے بعد کے علمائے تعلیم نے "اُصولِ تدریس" کے نام سے قایم کیے تھے:

(۱) تعلیم کا اُصول یہ ہونا چاہیئے کہ اوّل آسان باتیں بتلائی جائیں اور اس کے بعد پیچیدہ باتیں "اگر یہ ترتیب قایم نہ رکھی گئی تو بچّہ کو سوائے الفاظ کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اور نتیجہ یہ ہوگا کہ کند ذہن اور بدشوق ہوجائیگا"۔

(۲) "اگر معلوم چیزوں کو نامعلوم چیزوں کے ذریعہ سے نہیں سمجھانا چاہیئے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی سیّاح ان اشیاء کا حال بیان کرے جس کو اس نے بچشم خود دیکھا ہے اور ہم نے نہیں دیکھا اور وہ یہ کہے کہ فلاں چیز اس چیز کی مانند ہے جس کو ہم پہلے سے جانتے ہیں۔ اس اُصول سے جو غفلت برتی جاتی ہے اس کی بڑی مثال یہ ہے کہ انگریزی زبان کی صرف ونحو سے پہلے لاطینی زبان کی صرف ونحو کی تعلیم دی جاتی ہے"۔

پروفیسر سلی نے کیا خوب کہا ہے کہ "بچّے جب اسکول میں داخل ہونے آتے ہیں تو وہ اپنی مادری زبان انگریزی کی ایک معین شکل سے واقف ہوتے ہیں اور بہ آسانی ان فقروں کے حصّوں کو بتلایا جاسکتا ہے جو وہ بولتے ہیں اور یہی مراد صرف ونحو سے ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ بچّہ جس چیز سے واقف ہے اس کا تو کوئی استعمال نہیں کیا جاتا اور ایک بالکل نئی اور مشکل زبان یعنی لاطینی نحو سکھلایا جاتا ہے اور اسی کے ذریعہ سے صرف ونحو کے قواعد بیان کیے جاتے ہیں اور اس سب کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صرف ونحو کبھی سمجھ میں نہیں آتی"۔

(بعینہ یہی طریقہ ہمارے یہاں عربی تعلیم کا اختیار کیا جاتا ہے اور صرف و نحو
اُردو میں نہیں بلکہ فارسی میں پڑھائی جاتی ہے اور اس کے پڑھانے کا طریقہ بھی
ایسا ہی کہ میزان کی گردان ہی میں خاصہ وقت صرف ہو جاتا ہے۔)

(۳) مبہم وغیرہ معین چیزوں کی تعلیم معین چیزوں کے ذریعے سے ہونا چاہیئے۔

(۴) ہمارے اسباق مادیات سے شروع ہونے چاہئیں اور مجردات پر ختم ہونے چاہئیں
(پستالوزی نے بھی اسی اصول کے مطابق چیزوں کے شمار کرنے کی تعلیم کو
اعداد کی تعلیم پر مقدم قرار دیا ہے)

(۵) بچوں کی تعلیم اُسی اصول کے موافق ہونی چاہیے جس کے موافق نوع انسان کی تعلیم حاصل کی نشو و نما میں ایک فرد کو ان ہی حالات کا تابع ہونا چاہیئے جو نوع انسان کے نشو و نما کے لیے تھے۔

(۶) طریقۂ تعلیم ایسا ہونا چاہیئے جس سے بچوں کے اندر سبق سے شوق پیدا ہو اور اس لیے تعلیم ان کے واسطے پُر لطف ہو۔ بعض اُستاد اس سے بالکل مخالف رائے رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اسکول کا کام بے لطف ہوتا ہے۔ وہ اس کی اہمیت پر مُصر ہیں کہ اہم بات یہ ہے کہ بچوں کو محنت کا عادی بنایا جائے۔ اور اس کا طریقہ اُن کے نزدیک یہ ہے کہ ایسا کام دیا جائے جو انھیں خوشگوار نہ معلوم ہو۔

(۷) اسپنسر بہت زیادہ زور خود آموزی پر دیتا ہے یعنی بچوں کو اس بات کا عادی کرنا چاہیئے کہ وہ خود تحقیقات کریں اور نتائج اخذ کریں۔ پستالوزی نے بھی کہا ہے کہ بچوں کو باتیں سکھلانا نہیں چاہیئے بلکہ اُن کو موقعہ دینا چاہیئے کہ وہ اپنی طبیعت سے بات پیدا کر سکیں۔

(۸) اسپنسر کہتا ہے کہ "سزا مصنوعی نہیں ہونا چاہیئے بلکہ ایسی صورت اختیار کرنی چاہیئے کہ اپنے قصور کے لیے بچے کو قدرتی طور پر قدرتی سزا مل جائے۔ اگر کوئی بچہ اپنے کمرہ کی ترتیب خراب کر دے تو اس کی سزا یہ ہونی چاہیئے کہ اسی سے کمرہ درست کرایا جائے۔ اگر کوئی بچہ کھانے پر دیر سے آئے تو یہ سزا ہونی چاہیئے کہ اس کا انتظار نہ کیا جائے۔ اور کھانا شروع کر دیا جائے اور جو کھانے کھائے جا چکے اُن کا حصہ اُسے نہیں ملنا چاہیئے۔

جسمانی تعلیم کی بحث اسپنسر غذا سے شروع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ :-

" دنیا کی تاریخ عموماً یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ عمدہ خوراک کھانے والی قومیں قوی اور غالب رہی ہیں "

اس کی رائے میں صحت کا قائم رکھنا انسان کا اولین فرض ہے۔ اور دنیا میں ایک چیز ایسی بھی ہے جس کو ہم "جسمانی اخلاق" سے تعبیر کر سکتے ہیں چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ :-

" اگر دولت کے ساتھ لگاتار بیماریاں لگی رہیں تو دولت کے حاصل کرنے سے کیا فائدہ ہے۔ اس عزت و امتیاز کی کیا وقعت ہے جس کے ساتھ مراق بھی پیدا ہو جائے "

غرضکہ "رجوع الی الفطرۃ" کا تخیل نہ صرف روسو کے تعلیمی اصولوں اور پستالوزی کی عملیات کی خاص خصوصیت ہے بلکہ اسپنسر کے اصول معلمی کا بھی طغرائے امتیاز یہی خیال ہے۔

# کنڈر گارٹن

**کنڈر گارٹن سے کیا مراد ہے**

کنڈر گارٹن اصل میں جرمن زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ہیں "باغیچہ اطفال" فرانسیسی زبان میں اس کا لفظی ترجمہ کیا گیا ہے جو عام طور پر مستعمل ہے۔ انگریزی میں بھی اس کے لئے متعدد الفاظ تجویز ہوئے مثلاً Children Garden باغ اطفال Paradise Children فردوس اطفال Play Schools مگر قبولیت عام اسی جرمنی لفظ کو نصیب ہوئی۔ اردو میں عام طور سے جو ترجمہ مقبول ہوا وہ "گلزار نونہال" ہے لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ فوقیت اصل جرمنی لفظ ہی کو حاصل رہی۔ یہ نام فروبل نے ۱۸۴۰ء میں تجویز کیا تھا۔ اس لفظ سے اصلی مفہوم بخوبی واضح ہوتا ہے مگر مراد اس سے یہ نہیں ہے کہ بچوں کے لئے سچ مچ پھول پھل والا کوئی باغ موجود ہے بلکہ فروبل ہمیشہ بچے کو پودے سے، اسکول کو باغ سے اور استاد کو مالی سے تشبیہ دیا کرتا تھا، اس لئے اس لفظ سے

مراد ایک ایسا انسٹی ٹیوشن ہی جس کا مقصد یہ ہو کہ بچّوں کے مدرسہ میں داخل ہونے کی عمر سے پہلے ان کے کھیل کود اور تفریح کی خواہشات کو ایسے طور پر منضبط کیا جائے جس سے باقاعدہ اور تدریجی نشو و نما ان کے قوائے جسمانی و دماغی کا ہو سکے۔

کنڈر گارٹن کا مقصد جیسا کہ فروبل نے بیان کیا ہی یہ ہی کہ:-

> "خورد سالی کے زمانہ میں یعنی مدرسہ میں داخل ہونے کی عمر سے پہلے بچّے کنڈر گارٹن میں داخل ہونگے اور اس کا مقصد ہوگا کہ ایسے مشاغل میں مصروف رکھنے جو ان کی طبیعت کے مناسب ہوں ان کے جسموں کو توانا اور مضبوط کرنے ان کے حواس خمسہ کی پرداخت کرنے، قدرت اور سوسائٹی کی باتوں کو عاقلانہ طور سے مطلع کرنے اور خاصکر ان کے دل و دماغ کا نشو و نما کرنے یعنی جس طرح یونیورسٹیوں کی تعلیم کے لئے اسکول بمنزلہ پیش خیمہ کے متصور ہوتے ہیں۔ اسی طرح اسکول کی تعلیم کے لئے کنڈر گارٹن بھی بمنزلہ پیش خیمہ کے ہی"

**کنڈر گارٹن کی اہمیت** سنہ ۱۸۵۴ء میں ہنری برنارڈ نے اس کے متعلق یہ رائے ظاہر کی تھی کہ کنڈر گارٹن بچّوں کے نشو و نما و پرداخت کا ایک ایسا طریقہ ہی جس سے بڑھکر باعتبار اس کی دل آویزی اور فلسفیانہ حیثیت کے دنیا میں کوئی طریقہ نہیں۔

ڈاکٹر جمیس وارڈ صاحب نے یہ کہکر اس کی سچّی طور سے قدر کی ہی کہ "کنڈر گارٹن کے طریقۂ تعلیم سے بشرطیکہ معلم اس فن سے بخوبی واقف ہو، نہایت قابل قدر نتائج پیدا ہوتے ہیں لیکن اس طریقہ میں یہ اندیشہ ہوتا ہی کہ کہیں بجائے ندرت و تنوع کے وہ محض ایک مشین کی گردش نہ ہو جائے"

کنڈر گارٹن سے جو مطلب ہی اس کا خیال اگر اس کے کام میں دائر و سائر نہ ہو تو پھر یہ جسد بے روح سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا اور اس سے جو کچھ مقصود ہوتا ہی وہ بہت جلد فوت ہو جاتا ہے

**اس کی ابتدا** اگرچہ کنڈر گارٹن کی ایجاد کا سہرہ فروبل کے سر ہی لیکن یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ اس کے دماغ میں اس کا خیال ایک حد تک کومی نس کی تحریرات سے پیدا ہوا جس نے تدریس

اطفال کی ضرورت کو (جیسا کہ ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں) ثابت کیا تھا لیکن کومی نس بچوں کے کھیل کود کو اُن کی تعلیم کا اصل اصول قرار دینے سے قاصر رہا تھا۔ برخلاف اس کے فروبل کا قول تھا کہ میں بچوں کو کھیلتا دیکھ کر معلوم کر سکتا ہوں کہ بڑے ہو کر وہ کیا بنیں گے۔ کنڈر گارٹن کی ایجاد میں فروبل پستالوزی کا بھی ممنون ہے کیونکہ اُس نے پستالوزی کے قائم کردہ اصولوں کو تمام و کمال اختیار کر لیا تھا۔

فروبل کے دماغ میں چھوٹے بچوں کے لئے کسی ایسی درسگاہ کے قائم کرنے کا خیال جس میں تعلیم و تربیت کا ذریعہ کھیلوں کا ایک مرتب سلسلہ قائم کیا گیا ہو اُس وقت تک پیدا نہیں ہوتا جب تک کہ اُس کو ۱۸۳۵ء میں برگ ڈارف مقام کے ایک دارالیتامیٰ میں چھوٹے چھوٹے یتیم بچوں کی ضروریات پر غور کرنا نہ پڑا۔

بچوں کے حالات پر باحتیاط تمام غور کرنے اور ہر قسم کے کھیلوں کا تجربہ کرنے سے فروبل کو کھیلوں کی ایک ایسی روز افزوں تعداد کا علم ہو گیا جو بچوں کی مختلف قوائے کے نشو و نما دینے میں ممد و معاون ہوں۔ اُس نے کھیلوں کو حسب ذیل دو اقسام پر منقسم کیا ہے۔

(۱) وہ کھیل جس میں کسی ساز و سامان کی ضرورت نہیں اور ان کا نام اُس نے "اخلاقی کھیل" رکھا ہے۔

(۲) وہ کھیل جن کے لئے ساز و سامان کی ضرورت ہے۔ ان کو وہ Gift سے موسوم کرتا ہے۔

گفٹ کی بیس قسمیں کہی گئی ہیں جن کو میں اس باب کے آخر میں بیان کرونگا۔

فروبل اپنے اُن شاگردوں سے بہت زیادہ دق ہوتا تھا جو اس کے گفٹس کے فلسفیانہ مفہوم کو غلط طور سے سمجھتے اور ان کے صرف اس حصّے کو سمجھتے جو کھیل سے متعلق تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ان گفٹس کا اگر کوئی فائدہ ہے یا ان میں کوئی کارآمد بات ہے تو وہ اُس ساز و سامان کی وجہ سے نہیں ہے جو ان میں استعمال کیا جاتا ہے بلکہ اُن طریقوں پر منحصر ہے جو ان کے متعلق ہیں

استعمال کرتا ہوں۔

گرنالڈ صاحب نے اپنی کتاب میں جو فروبل کے تعلیمی اصولوں کے متعلق ہے کنڈرگارٹن کے طریقے کو بچوں کے حسب ذیل تین رجحانات پر منحصر کیا ہے۔

(۱) قوت مدرکہ

(۲) قوت فاعلہ

(۳) احساس انفرادیت یعنی قوت منفعلہ۔

یہ تمام قوتیں اور ادراکات فروبل کے ایجاد کردہ گفٹس کے ذریعے سے نشوونما پاتی ہیں۔

مختلف ممالک میں کنڈرگارٹن کے طریقہ کی تعلیم | جو حیرت انگیز ترقی اور مقبولیت عام کنڈرگارٹن کے طریقہ تعلیم کو گزشتہ ساٹھ سال حاصل ہوئی ہے وہ اس کے موجدوں اور بانیوں کے لئے بھی حیرت انگیز ہے۔ یہ طریقہ ہر ملک میں رائج ہوگیا اور دنیا کی مشہور زبانوں میں اس کا لٹریچر آگیا ہے۔ جن اشخاص نے ہر ملک میں اس کی اشاعت کے متعلق کوشش کی وہ فروبل کی مشہور شاگرد لیڈی وان بولو فروبل کی دوسری بیوی اور اس کا بھتیجا Eran Schrader ہیں۔

انگلستان اور فرانس ممالک یورپ کے وہ خاص ملک ہیں جہاں مدارس اطفال اب تک قائم ہیں اور جن میں نوشت وخواند کا ایک مسلسل پروگرام موجود ہے۔ فروبل کے اصولوں کے مطابق حال ہی میں ان مدارس کے نصاب تعلیم میں ترمیم کی گئی ہے۔ کنڈرگارٹن کے مدارس سب سے اول ۱۸۵۴ء میں لندن اور منچسٹر کے مقام پر لیڈی وان بولو کی مساعی جمیلہ کی بدولت جاری ہوئے اس کے بعد اور مدارس کھولے گئے اور یہ سب پرائیویٹ کوششوں کا نتیجہ تھے۔

کنڈرگارٹن کے طریقہ کی بدولت مدارس اطفال کے طریقۂ تدریس میں ایک انقلاب پیدا ہوگیا اور نوشت وخواند اور حساب کی تعلیم کا پرانا طریقہ بالکل متروک ہوگیا۔ اور بچوں کی تعلیم و تربیت فروبل کے بیان کردہ اصول کے مطابق ہونے لگی۔

سوئٹزرلینڈ | میں کنڈرگارٹن کا طریقہ اگرچہ سررشتہ مدارس کا کوئی جز نہیں بنایا گیا لیکن عام طور

سے اُس کے اصولوں کو مدرسہ کی تعلیم کی صحیح بنیاد تسلیم کی جاتی ہے اور پرائیویٹ درسگاہوں کو بہت تیزی کے ساتھ میونسپل درسگاہوں کی صورت میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ اس قسم کے مدارس کی مقبولیت کا حال اس واقعے سے معلوم ہوگا کہ ۱۹۰۵ء میں جب راقم الحروف سوئٹزرلینڈ گیا تو تنہا صرف ایک قصبہ یعنی Basil میں تہتر اسکول کنڈرگارٹن کے موجود تھے۔

جاپان | ایشیا اور افریقہ میں کنڈرگارٹن کے طریقے کی اشاعت کرنے والے پادری صاحبان ہیں لیکن جاپان میں اس طریقہ کو اس وقت رواج دیا گیا تھا جب کہ عیسائی مشنریوں نے اس کو اختیار نہیں کیا تھا۔ ۱۸۷۰ء کے اوائل میں حکومت جاپان نے اپنے چند ماہرین فن تعلیم کو اس غرض سے جرمنی بھیجا کہ وہ کنڈرگارٹن کے طریقے کے متعلق معلومات بہم پہنچائیں اور اپنے ملک کے تعلیمی نظام میں داخل کریں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۷۶ء میں ٹوکیو کے زنانہ نارمل اسکول کے ساتھ ایک کنڈرگارٹن کلاس جاری کیا گیا اور کنڈرگارٹن کے طریقے کو اُس ملک کے مدارس عامہ کے نظام میں داخل کرلیا گیا۔ ۱۹۰۴ء میں ایک سو پچاسی پبلک اور تقریباً ایک سو پرائیویٹ مدارس جاپان میں کنڈرگارٹن کے تھے جن میں چوبیس ہزار بچے تین سے چھ برس کی عمر میں (اسکول میں داخل ہونے کی عمر سے پہلے) درج رجسٹر تھے۔

امریکہ | ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں کنڈرگارٹن کے طریقہ کا بڑی خوشدلی کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا اور اس طریقۂ تعلیم کو بہت کچھ مقبولیت حاصل ہوئی۔ امریکہ میں اس طریقہ کی کامیابی کا اندازہ صرف کنڈرگارٹن مدارس کی کثیر تعدادی پر منحصر نہیں ہے بلکہ اس واقعہ پر ہے کہ کنڈرگارٹن کے اصولوں کو تعلیم کے ہر شعبہ اور ہر پہلو پر منطبق کیا گیا ہے۔

پہلا مدرسہ کنڈرگارٹن کا فروبل کے ایک شاگرد نے ۱۸۵۵ء میں جاری کیا تھا اس کے بعد پندرہ سال کی مدت میں جرمن زبان بولنے والی اقوام نے بہت سے جرمن کنڈرگارٹن مدارس جاری کئے۔ انگریزی کنڈرگارٹن کا پہلا مدرسہ ۱۸۶۰ء میں Pralody نے جاری کیا تھا جس کو امریکہ میں کنڈرگارٹن کے طریقہ کا پیغمبر خیال کیا جاتا ہے۔ اس طریقہ کی مقبولیت کا

اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ۱۸۸۰ء میں کنڈر گارٹن مدارس کی تعداد چار سو تھی اور ۱۹۰۳ء میں یہ تعداد تین ہزار تک جا پہنچی جن میں دو لاکھ بچے تعلیم پاتے تھے اس تعداد میں پرائیویٹ کنڈر گارٹن مدارس داخل نہیں ہیں جن کی تعداد تقریباً سو تھی۔

۱۹۰۴ء میں بمقام سینٹ لوئیس ممالک عالم کی جو نمائش ہوئی اس میں کنڈر گارٹن کو ممتاز جگہ دی گئی تھی۔

# کانفرنس گزٹ

میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے متعلق ہر قسم کے قابل اطلاع حالات درج
ہوتے رہتے ہیں اور مسلمانوں کی تعلیم کے جملہ ضروری مسائل پر بحث ہوتی ہے
اور نہایت سلیس اور عام فہم زبان میں مسلمانوں کو علوم جدیدہ سے روشناس
کرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ قیمت سالانہ مع محصول صرف تین روپیہ (۳ روپے)۔

نمونہ کے پرچہ کی قیمت ۴ر آنہ

ملنے کا پتہ

سلطان جہان منزل صدر دفتر کانفرنس علی گڈھ

# بفضل خدا

انسٹیٹیوٹ پریس میں (جو سرسید علیہ الرحمۃ کا قائم کردہ اور محمڈن کالج کی ملک
ہونے کی وجہ سے حقیقی معنوں میں ایک قومی پریس ہے) لوہے اور پتھر دونوں قسم
کے چھاپوں میں اردو، انگریزی کا ہر قسم کا کام بہت صحت اور کفایت سے ہوتا ہے
اور وقت پر دیا جاتا ہے۔ مطبع کو اس کے قدیم و اہلِ نظر سرپرستوں کی جانب سے
جو اطمینان بخش اسناد حاصل ہوئی ہیں ان کی نقل عند الطلب روانہ کی جا سکتی ہے
اہلِ ذوق و ضرورت کم از کم ایک بار ضرور امتحان فرمائیں۔ نرخ زبانی یا بذریعہ
خط و کتابت طے ہو سکتا ہے۔

ہر قسم کی خط و کتابت اور درخواستوں کے لئے پتہ:۔

**مینیجر صاحب انسٹیٹیوٹ پریس علی گڈھ**